

دارالمطالعہ
تحریک اسلامی مودان

اسلامی تہذیب

اور

اُس کے اصول و مبادی

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳-۸۱، شاہ عالم مارکیٹ لاہور (پاکستان)

فہرست

۴	۱۔ عرض ناشر
۶	۲۔ مقدمہ
۱۲	۳۔ باب اوّل
۱۳	دنیوی زندگی کا اسلامی تصور
۶۰	۴۔ باب دوم
۶۱	زندگی کا نصب العین
۱۰۱	۵۔ باب سوم
۱۰۲	اساسی افکار و عقائد
۱۰۴	۱۔ ایمان کی حقیقت و اہمیت
۱۱۸	۲۔ اسلام کے ایمانیات
۱۲۸	۳۔ ایمان باللہ
۱۴۱	۴۔ ایمان بالملائکہ
۱۸۰	۵۔ ایمان بالرسل
۲۱۶	۶۔ ایمان بالکتاب
۲۳۷	۷۔ ایمان بالیوم الآخر
۳۳۳	۸۔ ضمیمہ
	زندگی بعد موت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عرضِ ناشر

جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد اسلامی تہذیب کے بارے میں بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ کچھ اس کو اسلامی ثقافت کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو مسلمانوں کی عادات و رسومات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ بہت کم ایسے حضرات ہیں جو لفظ تہذیب کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں اور اس سے بھی کم وہ حضرات ہیں جو ”اسلامی تہذیب“ کا صحیح مفہوم سمجھتے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس ہی اُلجھے ہوئے جدید تعلیم یافتہ ذہن کو سامنے رکھ کر اپنے مخصوص علمی اور تحقیقی انداز میں اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے۔ آپ نے نہ صرف اُن تمام غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے جو ان ذہنوں میں موجود ہیں بلکہ ایجابی طور پر اسلامی تہذیب کو نہایت واضح اور منطقی صورت میں پیش کیا ہے۔ اپنے بلند پایہ مضامین کی وجہ سے یہ کتاب ملک و بیرون ملک کے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف یونیورسٹیوں کے طلباء خصوصاً ایم۔ اے اسلامیات و فلسفہ کے طلباء اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن مولانا موصوف کے دوسرے دورِ اسیری (۱۹۵۵ء) میں نظر ثانی کے بغیر شائع کیا گیا تھا۔ آپ کی رہائی کے بعد ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں دوسرا اور تیسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کیا گیا۔ اب اس کتاب کا یہ ایڈیشن آفسٹ کی نفیس طباعت

کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔
 ہمیں اُمید ہے کہ بلند پایہ کُتب کے شائقین اس کو پسند فرمائیں
 گے۔

۱۰ ذی الحج ۱۳۸۵ھ
 بمطابق ۲۲ اپریل ۱۹۶۶ء

مینجنگ ڈائرکٹر
 اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

مغربی مصنفین، اور ان کے اثر سے مشرقی اہل علم کا بھی ایک بڑا گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ اسلام کی تہذیب اپنے ماقبل کی تہذیبوں اور خصوصاً یونانی و رومی تہذیب سے ماخوذ ہے، اور وہ ایک جداگانہ تہذیب صرف اس وجہ سے بن گئی ہے کہ عربی ذہنیت نے اس پر انے مواد کو ایک نئے اسلوب سے ترکیب دے کر اس کی ظاہری شکل و صورت بدل دی ہے۔ یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر یہ لوگ اسلامی تہذیب کے عناصر ترکیبی، ایرانی، بابلی، سریانی، فینیقی، مصری، یونانی اور رومی تہذیبوں میں تلاش کرتے ہیں، اور پھر عربی خصائص میں اس ذہنی عامل کا سراغ لگاتے ہیں۔ جس نے ان تہذیبوں سے اپنے ڈھب کا مسالہ لے کر اسے اپنے ڈھنگ پر ترتیب دیا۔

غلط فہمی

لیکن یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ میں اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ ہر زمانہ میں انسان کا حال اس کے ماضی سے متاثر ہوتا ہے، اور ہر نئی تعمیر میں پچھلی تعمیروں کے مواد سے کام لیا جاتا ہے، مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب اپنی ذات و جوہر میں خالص اسلامی ہے اور کسی غیر اسلامی موثر کے اثر کا اس میں ذرہ برابر دخل نہیں ہے، البتہ عرضی امور میں عربی ذہنیت، عربی روایات اور ماقبل اور مابعد

کی تہذیبوں کے اثرات ضرور داخل ہو گئے ہیں۔ عمارت میں ایک چیز تو اس کا نقشہ، اس کا مخصوص طرز تعمیر، اس کا مقصد اور اس مقصد کے لئے اس کا مناسب و مطابق ہونا ہے، اور یہی اصل و اساس ہے دوسری چیز اس کا رنگ و روغن، اس کے نقش و نگار، اس کی زینت و آرائش ہے، اور یہ ایک جزوی و فروغی چیز ہے۔ پس جہاں تک اصل و اساس کا تعلق ہے۔ اسلامی تہذیب کا قصر کلیتہً اسلام کی اپنی تعمیر کا نتیجہ ہے۔ اس کا نقشہ اس کا اپنا ہے، کسی دوسرے نقشے کی مدد اس میں نہیں لی گئی ہے۔ اس کا طرز تعمیر خود اسی کا ایجاد کردہ ہے، کسی دوسرے نمونہ کی نقل اس میں نہیں کی گئی ہے۔ اس کا مقصد تعمیر نہ والا ہے، کوئی دوسری عمارت اس مقصد کے لئے نہ اس سے پہلے تعمیر کی گئی اور نہ اس کے بعد۔ اسی طرح اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی تعمیر ہونی چاہیئے تھی اسلامی تہذیب ٹھیک ویسی ہی ہے، اس مقصد کے لئے جو کچھ اس نے تعمیر کر دیا اس میں کوئی بیرونی ہندس نہ ترمیم کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اضافہ کی۔ باقی رہے جزئیات و فروع تو اسلام نے ان میں بھی دوسروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے حتیٰ کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی بیشتر اسلام کے اپنے ہیں۔ البتہ مسلمانوں نے دوسروں سے رنگ و روغن، نقش و نگار اور زینت و آرائش کے سامان لے کر اس میں اضافہ کر دیئے اور وہی دیکھنے والوں کو اتنے نمایاں نظر آئے کہ انہوں نے پوری عمارت پر نقل کا حکم لگا دیا۔

تہذیب کا مفہوم

اس بحث کا فیصلہ کرنے کے لیے سب سے پہلے اس سوال کا تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تہذیب کس چیز کو کہتے ہیں؟ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے، اُس کے علوم و آداب، فنون لطیفہ، صنائع

و بدائع، اطوار معاشرت، انداز تمدن اور طرز سیاست کا۔ مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں ہیں، تہذیب کے نتائج و مظاہر ہیں۔ تہذیب کی اصل نہیں ہیں، شجر تہذیب کے برگ و بار ہیں۔ کسی تہذیب کی قدر و قیمت ان ظاہری صورتوں اور نمائشی ملبوسات کی بنیاد پر متعین نہیں کی جاسکتی۔ ان سب کو چھوڑ کر ہمیں اس کی روح تک پہنچنا چاہیئے اور اس کے اساس اصول کا تجسس کرنا چاہیئے۔

تہذیب کے عناصر ترکیبی

اس نقطہ نظر سے سب سے پہلی چیز جس کا کسی تہذیب میں کھوج لگانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کا تصور کیا ہے؟ وہ اس دنیا میں انسان کی کیا حیثیت قرار دیتی ہے؟ اس کی نگاہ میں دنیا کیا ہے؟ انسان کا اس دنیا سے کیا تعلق ہے؟ اور انسان اس دنیا کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ یہ تصور حیات کا سوال ایسا اہم سوال ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال پر اس کا نہایت گہرا اثر ہوتا ہے، اور اس تصور کے بدل جانے سے تہذیب کی نوعیت بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔

دوسرا سوال جو تصور حیات کے سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ زندگی کے نصب العین کا سوال ہے۔ دنیا میں انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ یہ ساری تگ و دو، یہ تمام کشمکش، یہ سب جدوجہد اور محنت و مشقت آخر کس لئے ہے؟ وہ کیا چیز مطلوب ہے جس کی طرف آدمی کو دوڑنا چاہیئے؟ وہ کونسا مطلق نظر ہے جس تک پہنچنے کے لئے ابن آدم کو کوشش کرنی چاہیئے؟ وہ کونسا منہا ہے جسے انسان کو اپنی ہر سعی اور اپنے ہر عمل میں پیش نظر رکھنا چاہیئے؟ یہی مقصود و مطلوب کا سوال انسان کی عملی زندگی کا رخ اور اس کی رفتار متعین کرتا

ہے، اور اسی کے مطابق عمل کے طریقے اور کامیابی کے وسائل اختیار کیے جاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ زیر بحث تہذیب میں انسانی سیرت کی تعمیر کن بنیادی عقائد و افکار پر کی گئی ہے؟ انسان کی ذہنیت کو وہ کسے سانچے میں ڈھالتی ہے؟ انسان کے دل و دماغ میں کس قسم کے خیالات جاگزیں کرتی ہے؟ اور اس میں وہ کون سے محرکات ہیں جو اس کے نصب العین کے مطابق انسان کو ایک مخصوص قسم کی عملی زندگی کیلئے ابھارتے ہیں؟ یہ بات کسی بحث کی محتاج نہیں ہے کہ انسان کے قوائے عمل اسکے قوائے فکر کے تابع ہیں۔ اس کے دست و پا کو جو روح حرکت دیتی ہے وہ اس کے دل و دماغ سے آتی ہے۔ دل و دماغ پر جو عقیدہ، جو تخیل، جو مفکورہ پوری قوت کے ساتھ مسلط ہوگا، عملی قوتیں اُسی کے زیر اثر حرکت کریں گی۔ ذہن جس سانچہ میں ڈھلا ہوگا اسی کے مطابق جذبات، حسیات اور داعیات پیدا ہوں گے، اور انہی کے اتباع میں اعضاء و جوارح کام کریں گے۔ پس دنیا کی کوئی تہذیب ایک ایسی عقیدہ اور ایک بنیادی تخیل کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی، اور اس بنا پر تہذیب کو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت جانچنے کے لئے اس عقیدہ اور تخیل کو سمجھنا اور اس کے حسن و قبح کو جانچنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی عمارت کی مضبوطی و پائیداری کا حال معلوم کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کی بنیادیں کتنی گہری اور کتنی مضبوط ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ وہ تہذیب انسان کو بحیثیت ایک انسان کے کس طرح کا آدمی بناتی ہے؟ یعنی وہ کس قسم کی اخلاقی تربیت ہے جس سے وہ انسان کو اپنے نظریہ کے مطابق کامیاب زندگی بسر کرنے کیلئے تیار کرتی ہے؟ وہ کون سے خصائل، اوصاف اور نفسی خصائص ہیں جنہیں

وہ انسان میں پیدا کرنے اور نشوونما دینے کی کوشش کرتی ہے؟ اور اسکی مخصوص اخلاقی تربیت سے انسان کیسا انسان بنتا ہے؟ گو تہذیب کا اصل مقصد نظام اجتماعی کی تعمیر ہوا کرتا ہے، لیکن افراد ہی وہ مسالہ ہوتے ہیں جن سے جماعت کا قصر بنتا ہے اور اس قصر کا استحکام اس پر منحصر ہوتا ہے کہ اس کا ہر پتھر اچھا ترشا ہوا ہو، ہر اینٹ خوب پکی ہوئی ہو، ہر شہتیر مضبوط و پائیدار ہو، کوئی ٹکڑی گھن کھائی ہوئی نہ ہو، اور کسی حصہ میں ناکارہ، کچا اور بے جان مسالہ استعمال نہ کیا جائے۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ اس تہذیب میں انسان اور انسان کا تعلق اس کی مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے کس طرح قائم کیا گیا ہے؟ اس کے تعلقات اس کے خاندان سے، اس کے ہمسائیوں سے، اس کے دوستوں سے، اس کے ساتھ رہنے اور بسنے والوں سے، اس کے ماتحتوں سے، اس کے بالادستوں سے، خود اس کی اپنی تہذیب کے پیروؤں سے، اور اس کی تہذیب کی پیروی نہ کرنے والوں سے کس قسم کے رکھے گئے ہیں؟ اس کے حقوق دوسروں پر اور دوسروں کے حقوق اس پر کیا قرار دیئے گئے ہیں؟ اس کو کن حدود کا پابند کیا گیا ہے؟ اس کو آزادی دی گئی ہے تو کس حد تک، اور مقید کیا گیا ہے تو کس حد تک؟ اس سوال کے ضمن میں اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے تمام مسائل آجاتے ہیں۔ اور اسی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ زیر بحث تہذیب خاندان، سوسائٹی اور حکومت کی تنظیم کس ڈھنگ پر کرتی ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے۔ اس کی بنکوبین پانچ عناصر سے ہوتی ہے :-
۱۔ دنیوی زندگی کا تصور۔

۲۔ زندگی کا نصب العین۔

۳۔ اساسی عقائد و افکار۔

۴۔ تربیت افراد۔

۵۔ نظام اجتماعی۔

دنیا کی ہر تہذیب انہی پانچ عناصر سے بنی ہے، اور اسی طرح اسلامی تہذیب کی تکوین بھی انہی سے ہوئی ہے۔ اس کتاب میں میں نے اسلامی تہذیب کے پہلے تین عناصر کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ یہ تہذیب زندگی کے کس مخصوص تصور، کس خاص مقصدِ حیات، اور کس اساسی عقائد و افکار پر قائم کی گئی ہے، اور انہوں نے کس طرح اسے دنیا کی تمام تہذیبوں سے الگ ایک امتیازی شکل دے دی ہے۔ اس کے بعد آخری دو عناصر باقی رہ جاتے ہیں۔ جن سے اس کتاب میں بحث نہیں کی گئی ہے۔ ان میں سے ”تربیت افراد“ کے موضوع پر تو میری کتاب ”اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر“ اور ”خطبات“ (خطبہ نمبر ۲۰ تا ۲۸) کا مطالعہ مفید ہوگا۔ رہا ”نظام اجتماعی“ کا عنوان، تو اس کا ایک اجمالی نقشہ میری ان تقریروں میں مل جائے گا جو ”اسلام کا نظام حیات“ کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔

۲۔ ” ” ” ” ”

۳۔ ” ” ” ” ”

باب اول

دنیوی زندگی کا اسلامی تصور

- انسان کی حقیقت۔
- کائنات میں انسان کا درجہ۔
- انسان نائبِ خدا ہے۔
- منصبِ نبیائیت کی تشریح۔
- زندگی کا اسلامی تصور۔
- انسان نائب ہے نہ کہ مالک۔
- دنیا میں کامیابی کی اولین شرط۔
- دنیا برتنے کے لئے ہے۔
- دنیوی زندگی کا مال۔
- اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی۔
- انفرادی ذمہ داری۔
- زندگی کا فطری تصور۔
- مختلف مذاہب کے تصورات۔
- اسلامی تصور کی خصوصیت۔

دُنیوی زندگی کا اسلامی تصور

انسان کو ابتداء سے اپنے متعلق بڑی غلط فہمی رہی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی ہے۔ کبھی وہ افراط پر اُترتا ہے تو اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے زیادہ بلند ہستی سمجھ لیتا ہے۔ غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے۔ کسی طاقت کو اپنے سے بالا کر لیا معنی اپنا مد مقابل بھی نہیں سمجھتا۔ مَنْ أَشَدَّ مَنَاقُوزًا اور أَنَا رَبُّكُمْ إِلَّا عَلَىٰ كِي صدا بلند کرتا ہے اور اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے کبھی تفریط کی جانب مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دُنیا کی سب سے زیادہ ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے۔ درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، جانور، ہوا، آگ، بادل، بجلی، چاند، سورج، تارے، غرض ہر اس چیز کے سامنے گردنے جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا مضرت یا منفعت نظر آتی ہے، اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو اُن کو بھی دیوتا اور معبود مان لینے میں تامل نہیں کرتا۔

انسان کی حقیقت

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصلی حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے :-

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ - خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ

دَافِقٍ يُخْرِجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ (الطارق)
 ”انسان اپنی حقیقت تو دیکھے کہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے؟ ایک
 اچھلتے ہوئے پانی سے جو پشت اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے کھنچ
 کر آتا ہے۔“

أَوَلَمْ يَرِ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا
 هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ
 (یس ۷۸/۷۷)

”کیا انسان یہ نہیں دیکھتا کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ آب سے
 بنایا ہے، اور اب وہ کھلم کھلا حریف بننا ہے اور ہمارے لیے مثالیں
 دیتا ہے اور اپنے اصل کو بھول گیا ہے۔“

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ
 مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ
 فِيهِ مِنْ رُّوحٍ رَبِّهِ (السجده - رکوع ۱)

”انسان کی ابتدا مٹی سے کی، پھر مٹی کے پھوڑے سے جو ایک حقیر پانی
 ہے اس کی نسل چلائی، پھر اس کی بناوٹ درست کی اور اس میں اپنی
 روح پھونکی۔“

فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ
 مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ
 لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ، وَنُقَرِّ فِي الْأُمِّ حَامٍ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ
 مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِيَبْلُغُوا أَشَدَّكُمْ
 وَمِنْكُمْ مَّنْ يُتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ
 الْعُصْرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا۔

”ہم نے تم کو مٹی سے، پھر قطرہ آب سے، پھر خون کے لو تھڑے سے، پھر پوری اور ادھوری بنی ہوئی بوٹی سے پیدا کیا تاکہ تم کو اپنی قدرت دکھائیں۔ اور ہم جس نطفہ کو چاہتے ہیں ایک مدت مقررہ تک رحم مادر میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں، پھر تم کو بڑھا کر جوانی کو پہنچاتے ہیں۔ تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کو پہنچ جاتا ہے کہ سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد پھر نا سمجھ ہو جائے۔“

يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي
خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ
رَبُّكَ - (الانفطار: ۸/۶)

”اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کر دیا؟ اُس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضاء درست کیے، تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی۔“

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ
شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (النحل: ۷۸)

”اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا۔ جب تم نکلے تو اس حال میں تھے کہ تم کچھ بھی نہ جانتے تھے۔ اس نے تم کو کان دیئے، آنکھیں دیں، دل دیئے۔ شاید کہ تم شکر کرو۔“

أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ ۝ أَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهَا
أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ - نَحْنُ قَدْ نَابَيْتُكُمْ الْمَوْتَ
وَمَا نَحْنُ بِمُسْبِقِينَ عَلَى أَنْ تُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ

وَنُنَشِّئُكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ - وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ
 الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ - أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ
 ؕ أَنْتُمْ تَزْرَعُونَهَا أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ - لَوْ نَشَاءُ
 لَجَعَلْنَاهَا حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ - إِنَّا الْمَغْرُمُونَ
 بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ؕ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي
 تَشْرَبُونَ ؕ ؕ أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ
 الْمُنْزِلُونَ ؕ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ أُنْجَابًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ؕ
 أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ؕ ؕ أَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ
 شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ؕ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً
 وَمَتَاعًا لِلْمُقْوِينَ ؕ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ

(الواقعه - ۵۸/۷۴)

»کیا تم نے اس نطفہ پر غور کیا جسے تم عورتوں کے رحم میں ٹپکاتے
 ہو؟ اس سے (بچہ) تم پیدا کرتے ہو یا ہم اس کے پیدا کرنیوالے
 ہیں؟ ہم نے ہی تمہارے درمیان موت کا اندازہ مقرر کیا ہے اور ہم
 اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جسمانی شکلیں بدل دیں اور ایک اور
 صورت میں تم کو بنادیں جس کو تم نہیں جانتے۔ اور تم اپنی پہلی پیدائش
 کو تو جانتے ہی ہو۔ پھر کیوں نہیں اس سے سبق حاصل کرتے؟ پھر
 کیا تم نے دیکھا کہ یہ کھیتی باڑی جو تم کرتے ہو، اس کو تم اگاتے ہو یا
 اگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو مجس بنادیں اور تم
 باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم نقصان میں رہے بلکہ محروم رہ گئے۔ پھر
 کیا تم نے اس پانی کو دیکھا، جسے تم پیتے ہو؟ اس کو تم نے بادلوں
 سے اتارا ہے یا اتارنے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو
 کھاری بنادیں۔ پس کیوں نہیں شکر ادا کرتے؟ پھر کیا تم نے اس

اگ کو دیکھا جسے تم سُلگاتے ہو، جن درختوں سے یہ جلانی جاتی ہے ان کو تم نے پیدا کیا ہے یا پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو ایک یاد دلانے والی چیز اور مسافروں کے لئے سامانِ زیست بنایا ہے۔ پس اے انسان اپنے خدائے بزرگ کی تسبیح کر۔
وَإِذْ أَمْسَكُ الصُّرُفِ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ
إِلَّا آيَاتُهُ، فَلَمَّا نَجَّاهُ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضُوا
وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا أَفَأَمِنْتُمْ أَنْ يَخْسِفَ
بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ أَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ
لَا تَجِدُوا لَكُمْ وَصِيلاً أَمْ أَمِنْتُمْ أَنْ يُعِيدَكُمْ
فِي سَائِرَةِ الْأَرْضِ فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِنَ
الرِّيحِ فَيُغْرِقَكُم بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ
عَلِيْنَا بِهَا تَدِيْعًا (بنی اسرائیل، ۶۹/۷۷)

”جب کبھی سمندر میں تم پر طوفان کی مصیبت آئی تو تم اپنے سب

معبودانِ باطل کو بھول گئے اور اس وقت خدا ہی یاد آیا۔ پھر جب اس نے تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیا تو تم پھر اعراض کی روش پر اتر آئے۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر ہوا کا طوفان بھیج دے اور تم کوئی اپنا مددگار نہ پاؤ؟ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے کہ خدا تم کو دوبارہ اس سمندر میں لے جائے اور تم پر ہوا کا ایسا جھکڑ بھیج دے جو تمہیں تمہاری نافرمانی کے بدلے میں غرقاب کر دے اور پھر تم ہمارا بیچا کرنے والا کوئی حائثی نہ پاؤ؟“

ان آیات میں انسان کے غرور و تکبر کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ۔ ایک نجس اور حقیر

پانی کا قطرہ جو رجم مادر میں مختلف قسم کی نجاستوں سے پرورش پا کر گوشت کا ایک لوتھڑا بنتا ہے۔ خدا چاہے تو اس لوتھڑے میں جان ہی بٹھالے اور وہ یونہی غیر مکمل حالت میں خارج ہو جائے۔ خدا اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں آتا ہے۔ مگر تیری ابتداء حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس میں اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت نہیں ہوتی۔ خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، طاقتور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں۔ تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ تیرا علم نسیا منسیا ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے۔ مال، اولاد، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ اس مختصر عرصہ حیات میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں ہے۔ تجھ سے بالاتر ایک قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، یہ پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے، نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان

کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو ترو
بالا کر دیتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلے
کا جھٹکا تجھے بیوندِ خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو،
اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تدبیر یا
ایجاد کرے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری اپنی حاصل کردہ نہیں ہے)
کیسے ہی ساز و سامان مہیا کرے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ
سب چیزیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس بل بوتے پر اگرتا ہے،
پھولا نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا، فرعونیت اور نمرودیت
کا دم بھرتا ہے، جبار و قہار بنتا ہے، ظالم و سرکش بنتا ہے، خدا کے
مقابلے میں بغاوت کرتا ہے، خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے اور خدا
کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

کائنات میں انسان کا درجہ

یہ تو تھی تکبر شکنی۔ دوسری طرف اسلام نوعِ بشر کو بتاتا ہے کہ وہ
اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ وہ
کہتا ہے:-

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ
وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى
كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔ (بنی اسرائیل۔ ۷۰)

”اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری
میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت
سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت
عطا کی ہے۔“

الْمُرْتَرَاتِ اللَّهُ سَخَّرَ لَكُمْ مَافِي

الانسان۔ (الحج ۷۵)

”اے انسان کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو جو

زمین میں ہیں تمہارے لئے مطیع بنا دیا ہے۔“

”اور جانوروں کو پیدا کیا جن میں تمہارے لئے سردی سے

حفاظت کا سامان ہے اور منفعتیں ہیں اور ان میں سے بعض

کو تم کھاتے ہو۔ ان میں تمہارے لئے ایک شانِ جمال ہے

جب کہ تم صبح ان کو لے جاتے ہو اور شام واپس لاتے ہو۔

وہ تمہارے بوجھ ڈھو کر اس مقام تک لے جاتے ہیں جہاں

تک تم بغیر جانکاہی کے نہیں پہنچ سکتے۔ تمہارا رب بڑا مہربان

اور رحم کرنے والا ہے۔ گھوڑے اور خچر اور گدھے تمہاری سواری

کے لئے ہیں اور سامانِ زیست ہیں۔ خدا اور بہت سی چیزیں

پیدا کرتا ہے جن کا تم کو علم بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہی ہے

جس نے آسمان سے پانی اُتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے

کے لئے ہے، اور کچھ درختوں کی پرورش کے کام آتا ہے جن

سے تم اپنے جانوروں کا چارہ حاصل کرتے ہو۔ اس پانی

سے خدا تمہارے لئے کھیتی اور انگور اور طرح طرح کے پھل

اُگاتا ہے، ان چیزوں میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو

غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔ اُسی نے تمہارے لئے رات

اور دن اور سورج اور چاند اور تارے مسخر کئے ہیں۔ یہ سب

اسی خدا کے حکم سے مسخر ہیں۔ ان میں نشانیاں ہیں ان

لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور بہت سی وہ

مختلف الالوان چیزیں جو اس نے زمین میں تمہارے لئے پیدا

کی ہیں، ان میں سبق حاصل کرنے والوں کے لئے بڑی نشانی

ہے۔ اور وہ خدا ہی ہے جس نے سمندر کو مسخر کیا کہ اس سے تم تازہ گوشت (مچھلی) نکال کر کھاؤ، اور زینت کا سامان (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو۔ اور تو دیکھتا ہے کہ کشتیاں پانی کو چیرتی ہوئی سمندر میں بہتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ سمندر کو اس لئے بھی مسخر کیا ہے کہ تم لوگ اللہ کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو) شاید کہ تم شکر بجا لاؤ۔ اس نے زمین میں پہاڑ لگا دیئے کہ زمین تم کو لے کر جھک نہ جائے اور دریا اور راستے بنا دیئے کہ تم منزل مقصود کی راہ پاؤ، اور بہت سی علامات بنائیں، منجملہ ان کے تارے بھی ہیں جن سے لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرو تو ان کو بے حساب پاؤ گے۔“

(النحل: ۵/۱۸)

ان آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تیری خدمت اور فائدہ کے لئے مسخر کی گئی ہیں اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور روشنی، یہ چاند، یہ تارے، غرض یہ سب چیزیں جن کو تو دیکھ رہا ہے، تیری خادم ہیں، تیری منفعت کے لئے ہیں، اور تیرے لئے ان کو کار آمد بنایا گیا ہے۔ تو ان سب پر فضیلت رکھتا ہے۔ تجھ کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے، تجھ کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تو اپنے ان خادموں کے سامنے سر جھکاتا ہے، ان کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہے؟ ان کے آگے دستِ سوال دراز کرتا ہے؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں کرتا ہے؟ ان سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتا ہے؟ اس طرح

تو اپنے آپ کو خود ذلیل کرتا ہے، اپنا مرتبہ آپ گراتا ہے، خادموں کا خادم، غلاموں کا غلام خود بننا ہے۔
انسان نائبِ خدا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بزرگم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس دنیا میں انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟ اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے۔

”اور جب کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ کیا تو زمین میں اُس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلا گا، اور خونریزیاں کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدمؑ کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ۔ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری، ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے، تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ہے۔ خدا نے کہا اے آدمؑ ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتا۔ پس جب آدمؑ نے ان کو ان اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا، کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں؟ اور جب ہم نے ملائکہ سے

کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا، بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدمؑ سے کہا کہ اے آدمؑ تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں سے چاہو با فراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے اس سے ان کو نکلوا دیا۔“

(البقرة: ۳۶/۳۷)

”اور جب کہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے ایک بشر بنانے والا ہوں پھر جب میں اس میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے لئے سر بسجود گر جانا۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ خدا نے کہا ابلیس! تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا؟ ابلیس نے کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ اُس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے کالے سڑے ہوئے سوکھے گارے سے بنایا ہے خدا نے کہا تو جنت سے نکل جا کہ تو راندہ درگاہ ہے اور یوم الجزاء تک تجھ پر پھٹکا رہے۔“ (الحجر: ۳۵/۲۸)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا، اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ میرے اس نائب

کو سجدہ کرو، فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا، اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی، مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اس کو نیابتِ خداوندی کا اہل بنا دیا۔ فرشتوں نے اسکی اس فضیلت کو تسلیم کر لیا، اور اس کے آگے جھک گئے، لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی، مگر اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگ لی کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکایا، جنت سے نکلوا دیا، اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا اور اپنے اڑلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانا ہوگا۔

منصبِ نیابت کی تشریح

اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں:-

انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی ہے۔ خلیفہ کہتے ہیں نائب کو۔ نائب کا کام یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اس کی اطاعت کرے۔ وہ نہ تو اس کے سوا کسی اور کی اطاعت کر سکتا ہے کہ ایسا کرے تو باغی سمجھا جائے گا، اور نہ وہ اس کا مجاز ہے کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں اور غلاموں کو خود اپنی رعیت، اپنا نوکر، اپنا خادم، اپنا غلام بنالے کہ ایسا کرے گا تب بھی باغی قرار دیا جائے گا، اور دونوں حالتوں میں سزا کا مستحق ہوگا۔ اس کو جس جگہ بنایا گیا ہے وہاں وہ اپنے آقا کی املاک میں تصرف کر سکتا ہے، ان کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے، اس سے خدمت لے سکتا ہے،

ان کی نگرانی کر سکتا ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے، اور نہ اس حیثیت سے کہ اس آقا کے سوا کسی اور کا ماتحت ہے، بلکہ صرف اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نائب ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے، اس کی ہدایت پر عمل کرے، اس کے احکام سے سرتابی نہ کرے۔ اس کی املاک، اس کی رعیت، اس کے نوکروں، اسکے خادموں اور اس کے غلاموں پر حکومت کرنے، اُن سے خدمت لینے، ان میں تصرف کرنے اور ان کی نگرانی کرنے میں اس کے بنائے ہوئے قوانین پر کاربند ہو۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نائب نہیں باغی ہوگا، پسندیدہ نہیں مردود ہوگا، مستحق انعام نہیں مستوجب سزا ہوگا۔

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ه وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ه (البقرة: ۲۹/ ۲۸)

”تو جس نے میری ہدایات کی پیروی کی ایسے لوگوں کے لئے۔

کسی سزا کا خوف اور کسی نامرادی کا رنج نہیں ہے اور جنہوں نے نافرمانی کی اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“

نائب اور امین خود مختار نہیں ہوتا کہ اپنی مرضی سے جو چاہے کرے، اپنے آقا کے مال اور اس کی رعیت میں جیسا چاہے تصرف کرے، اور اس سے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ بلکہ وہ اپنے آقا کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے، اس کو پائی پائی کا حساب دینا ہوتا ہے، اس کا آقا اس کی ہر حرکت کے متعلق سوال کر سکتا ہے، اور اس کی امانت اسکے مال

اور اس کی رعیت میں اس نے جس طرح تصرف کیا ہے اس کے لئے اس کو ذمہ دار قرار دے کر جزاء اور سزا دے سکتا ہے۔

نائب کا اولین فرض یہ ہے کہ جس کا وہ نائب ہے اسکی فرمانروائی، اس کی حکومت، اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا، نہ اپنے امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار اور جواب دہ ہونے کا احساس کر سکے گا۔ اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی دوسرے تختی کے تحت انسان وہ طرزِ عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تختی کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بغرض محال اس کا طرزِ عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرتے سے انکار کر کے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے، اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اچھے عمل کیے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے، اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بیکار ہیں۔

انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک حقیر مخلوق ہے، مگر اس کو جو عزت حاصل ہوئی ہے وہ اس رُوح کی بنا پر ہے جو اس میں پھونکی گئی ہے اور اس نیابتِ الہی کی بنا پر ہے جو اسے اس زمین میں عطا کی گئی ہے۔ اب اس عزت کی حفاظت منحصر ہے اس پر کہ وہ شیطان کی پیروی کر کے اپنی رُوح کو گندہ نہ کر دے اور اپنے آپ کو نیابت کے درجہ سے گرا کر بغاوت کے مرتبے میں نہ لے جائے، کیونکہ اسے حالت میں وہ پھر وہی ایک حقیر ہستی رہ جائے گا۔

ملکوتی طاقتیں انسان کے نائبِ خدا ہونے کو تسلیم کر چکی ہیں اور وہ اس کے آگے بحیثیت نائبِ خدا ہونے کے جھکی ہوئی ہیں مگر شیطانی طاقتیں اس کی نیابت کو تسلیم نہیں کرتیں اور وہ اسے اپنا تابع بنانا چاہتی ہیں۔ انسان اگر دنیا میں نیابتِ الہی کا حق ادا کرے گا اور خدا کی ہدایت پر چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ دیں گی۔ ملائکہ کی فوجیں اس کے لئے اتریں گی۔ وہ عالم ملکوت کو کبھی اپنے سے منحرف نہ پائے گا۔ ان طاقتوں کی مدد سے وہ شیطان اور اس کے لشکروں کو مغلوب کر لے گا۔ لیکن اگر وہ نیابت کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے گا اور خدا کی ہدایت پر نہ چلے گا تو ملکوتی طاقتیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی، کیونکہ اس طرح وہ خود اپنے منصبِ نیابت سے دست بردار ہو چکا ہوگا۔ اور جب اس کا ساتھ دینے والی کوئی طاقت نہ رہے گی اور وہ محض مٹی کا ایک پتلا رہ جائے گا تو شیطانی قوتیں اس پر غالب آجائیں گی۔ پھر شیطان اور اس کے لشکر ہی اس کے حمایتی اور مددگار ہوں گے، انہی کے احکام کی وہ پیروی کرے گا اور انہی کا سا انجام اس کا بھی ہوگا۔

نائبِ خدا ہونے کی حیثیت سے انسان کا درجہ دنیا کی تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی ماتحت ہیں اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لئے ذلت ہے اگر وہ جھکے گا تو اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا اور گویا نیابتِ الہی کے منصب سے خود دست بردار ہو جائے گا۔ لیکن ایک ہستی ایسی ہے جس کے سامنے جھکنا اور جس کی اطاعت کرنا اس کا فرض ہے، اور جس کو سجدہ کرنے میں اس کے لئے عزت ہے۔ وہ ہستی کون ہے؟ خدا اس کا آقا،

وہ جس نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے۔

نوع انسانی کا کوئی مخصوص فرد یا مخصوص گروہ نائبِ خدا نہیں ہے، بلکہ پوری نوع انسانی نیابتِ الہی کے منصب پر سرفراز کی گئی ہے اور ہر انسان خلیفہٴ خدا ہونے کی حیثیت سے دوسرے انسان کے برابر ہے۔ اس لئے نہ کسی انسان کو دوسرے انسان کے آگے جھکنا چاہیے اور نہ کسی کو یہ حق ہے کہ اپنے آگے جھکنے کا کسی دوسرے انسان سے مطالبہ کرے۔ ایک انسان دوسرے انسان سے صرف اس چیز کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ آقا کے حکم اور اس کی ہدایت کی پیروی کرے۔ اس معاملہ میں پیروی کرنے والا آمر ہوگا اور پیروی نہ کرنے والا مأمور، کیونکہ جو نیابت کا حق ادا کرتا ہے وہ حق نیابت ادا نہ کرنے والے سے افضل ہے۔ مگر فضیلت کے معنی یہ نہیں کہ وہ خود اس کا آقا ہے۔

نیابت اور امانت کا منصب ہر انسان کو شخصاً شخصاً حاصل ہے۔ اس میں کوئی مشترک ذمہ داری نہیں ہے۔ اس لئے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اس منصب کی ذمہ داریوں کے بارے میں جوابدہ ہے۔ نہ ایک پر دوسرے کے عمل کی جواب دہی عائد ہوتی ہے، نہ ایک کو دوسرے کے عمل کا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے، نہ کوئی کسی کو اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر سکتا ہے، اور نہ کسی کی غلط روی کا وبال دوسرے پر پڑ سکتا ہے۔ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتے (جسدِ انسانی) اور خدا کی مہونگی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافتِ ارضی کے منصب سے الگ ہو جاتا ہے۔ اس کے زمانہ نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیے، اس کے سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب

ہونا چاہیئے، اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں ان کی تحقیقات ہونی چاہیئے کہ اس نے ان کو کس طرح انجام دیا۔ اگر اس نے غبن، خیانت، نافرمانی، بغاوت اور نافرمانی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیئے، اور اگر ایمان داری، فرض شناسی، اطاعت کوئی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے۔

زندگی کا اسلامی تصور

اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اور اہم نکتہ کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ نائب کا اصلی کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا تصرف خود حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کیلئے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیت کی خبرگیری، شفقت، مہربانی، حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبیر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔

پس جب انسان کو خدا کا خلیفہ اور نائب قرار دیا گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان خدا کی نیابت و خلافت کا پورا حق اسی وقت ادا کر سکتا ہے جب خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اس کے روش بھی ویسی ہی ہو جیسی خود خدا کی روش ہے۔ یعنی جس شان ربوبیت کے ساتھ خدا اپنی مخلوق کی خبرگیری اور پرورش کرتا ہے ویسی ہی شان کے ساتھ انسان بھی اپنے محدود دائرہ عمل میں ان چیزوں کی خبرگیری اور پرورش کرے جو اللہ نے اہل کے قبضہ قدرت میں دی ہیں۔

اسی طرح جس شانِ رحمانی و رحیمی کے ساتھ خدا اپنی ملکیت میں تصرف کرتا ہے، جس شانِ عدل کے ساتھ خدا اپنی مخلوقات میں نظم قائم کرتا ہے، جس شانِ رحم و کرم کے ساتھ خدا اپنی صفتِ قہر و جبر کا اظہار کرتا ہے چھوٹے پیمانہ پر اسی شان کے ساتھ انسان بھی خدا کی اُس مخلوق کے ساتھ معاملہ کرے جس پر اللہ نے اس کو حکومت بخشی ہے اور جسے اس کے لئے مسخر کیا ہے۔ یہی مفہوم ہے جو تَخْلَقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ مگر یہ اعلیٰ اخلاقی مرتبہ صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انسان اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ اس دنیا میں کوئی خود مختار فرمانروا نہیں ہے بلکہ اس کے حقیقی فرماں روا کا نائب ہے، اور یہی نیابت کا منصب ہے جو دنیا کی تمام اشیاء حتیٰ کہ خود اپنے جسم۔ اور جسمانی و نفسانی قوتوں کے ساتھ اسکے تعلق کی حیثیت اور حدود متعین کرتا ہے۔

منصبِ نیابت کی تشریح میں یہ جتنے نکات بیان ہوئے ہیں ان سب کی تفصیل قرآن مجید میں موجود ہے جس سے دنیا اور انسان کے باہمی تعلق کا ہر پہلو روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔

انسان نائب ہے نہ کہ مالک
کہا گیا ہے کہ :-

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ وَنَافَعُ
بَعْضُكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا
آتَاكُمُ۔ (الانعام: ۱۶۶)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں نائب بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض سے اُوپے درجے دیئے تاکہ جو کچھ اس نے تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔“

قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عُدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ
 فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ (الاعراف: ۱۲۹)
 ”موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے کہا قریب ہے کہ خدا تمہارے
 دشمن کو ہلاک کرے اور تمہیں زمین کی خلافت دے تاکہ دیکھے تم
 کیسے عمل کرتے ہو۔“

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم
 بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ
 سَبِيلِ اللَّهِ۔ إِنَّ الَّذِينَ يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ
 لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ۔
 (ص: ۲۶)

”اے داؤد! ہم نے تجھ کو زمین میں اپنا نائب بنایا ہے پس تو
 لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور اپنے خواہش نفسے
 کی پیروی نہ کر کہ یہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ
 اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کے لئے اس بنا پر سخت
 عذاب ہے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔“

أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ۔ (التین)
 ”کیا خدا تمام حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟“

إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ۔ (الانعام: ۵۷)
 ”حکومت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے۔“

قُلْ لِلَّهِ مَلِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ
 تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ
 تَشَاءُ وَتُزِيلُ مَنْ تَشَاءُ۔ (آل عمران: ۲۸)

”کہو کہ خدایا! ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا

ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے معزز کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔“

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا
مِنْ دُونِهَا أَوْلِيَاءَ۔ (الاعراف: ۳)

”جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے ہدایت بھیجی گئی ہے صرف اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے کار سازوں کی پیروی نہ کرو۔“

قُلْ إِنَّا صَلَوَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ
رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (الانعام: ۱۶۳)

”کہو کہ میری نماز اور میری عبادت اور میری زندگی اور میری موت سب خدا کیلئے ہے جو رب العالمین ہے۔“

یہ آیات بتاتی ہیں کہ دنیا میں جتنی چیزیں انسان کے زیر تصرف اور زیر حکم ہیں حتیٰ کہ خود اس کا نفس بھی اسکی ملک نہیں ہے۔ اصلی مالک اور حاکم اور فرماں روا خدا ہے۔ انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان چیزوں میں مالکانہ تصرف کرے اور من مانے طریقوں سے ان کو استعمال کرے اس کی حیثیت دنیا میں صرف نائب کی ہے اور اس کے اختیار کی حد بس اتنی ہے کہ خدا کی ہدایت پر چلے اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق ان چیزوں میں تصرف کرے۔ اس حد سے تجاوز کر کے اپنے نفس کی پیروی کرنا یا فرمانروائے حقیقی کے سوا کسی اور فرماں روا کی پیروی کرنا بغاوت اور گمراہی ہے۔

دُنیا میں کامیابی کی اولین شرط
کہا گیا کہ :-

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوا بِاللَّهِ أُولَٰئِكَ

هُمْ الْخَسِرُونَ۔ (العنکبوت: ۵۲)

”اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ سے کفر کیا۔ وہی

در اصل نقصان میں ہیں۔“

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ
كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ خَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ
الْآخِرَةِ۔ (البقرہ: ۲۱۷)

”تم میں سے جو کوئی اپنے دین یعنی خدا کی اطاعت سے پھر گیا

اور اس حال میں مرا کہ وہ کافر تھا تو ایسے تمام لوگوں کے اعمال
دُنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔“

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ خَبِطَ عَمَلُهُ
وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَسِرِينَ۔ (المائدہ: ۵)

”اور جو کوئی ایمان لانے سے انکار کرے اس کا عمل ضائع

ہو گیا۔ اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نائبِ خدا ہونے کی حیثیت سے
دُنیوی زندگی میں انسان کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ جس کا وہ نائب
ہے اس کی فرماں روائی تسلیم کرے۔ اور دُنیا میں جو کچھ کرے یہ سمجھ
کر کرے کہ میں خدا کا نائب اور اس کا امین ہوں۔ اس حیثیت کو تسلیم
کیے بغیر خدا کی ملکیت میں وہ جس قدر تصرف کرے گا وہ محض باغیات
تصرف ہوگا۔ اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ باغی اگر کسی ملک پر تصرف
ہو کر بہتر کارگزاری بھی دکھائے تب بھی ملک کی اصلی حکومت اسکے
حسنِ عمل کو تسلیم نہ کرے گی۔ بادشاہ کی نگاہ میں باغی بہر حال باغی ہوگا،
خواہ اس کی ذاتی سیرت اچھی ہو یا بُری، خواہ بغاوت کر کے اس نے
ملک میں اچھی طرح تصرف کیا ہو یا بُری طرح۔

دنیا برتنے کے لئے ہے کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا
طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ
مُبِينٌ - إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا
عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ - (البقرہ: ۱۶۹/۱۷۸)

”اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ
اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تو تمہیں ہدیے
اور بے حیائی کا اور خدا کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے
جو تم نہیں جانتے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحْرِمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ
اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ،
وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ وَحَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي
أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ - (المائدہ: ۸۸/۸۷)

”اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے
حلال کی ہیں۔ ان کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور حد سے بھی نہ گزرو کہ اللہ
حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں
میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں۔ اور اس خدا کے غضب
سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔“

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ
لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ - (الاعراف: ۳۲)

”کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کیا ہے جو اللہ نے
اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے اور کس نے پاک رزق کو حرام کر دیا

ہے؟“

يَا مُرْهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ
وَيَضَعُ عَنْهُمْ أَصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ
عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف - ۱۵۷)

”ہمارا پیغمبر ان کو نیکی کا حکم کرتا، اور بدی سے روکتا ہے۔
اور ان کے لئے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔
اور ان پر سے اس بوجھ اور ان بندشوں کو دور کرتا ہے۔ جو ان پر
تھیں۔“

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِمَّنْ
رَأَيْتُمْ۔ (البقرہ - ۱۹۸)

”تمہارے لئے اس میں کوئی حرج نہیں کہ اپنے رب کا فضل
(یعنی کاروبار کے ذریعے سے روزی) تلاش کرو۔“

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوا عَوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ
إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ۔ (الحديد - ۲۷)

”اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیرووں نے خود نکال لیا
تھا۔ یہ انہوں نے محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا
وہ ہم نے ان پر نہیں لکھا تھا۔“

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِینِ
وَالِإِنْسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ
لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْغَافِلُونَ۔ (الاعراف - ۱۷۹)

”ہم نے جہنم کے لئے بہترے جن اور انسان پیدا کئے ہیں۔
 اُن کے پاس دل ہیں مگر ان سے سوچتے سمجھتے نہیں اور ان کے پاس
 آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان
 سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ
 گئے گزرے۔ یہی لوگ غفلت میں ہیں۔“

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان کا کام دُنیا کو چھوڑ دینا نہیں ہے،
 نہ دُنیا کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے پرہیز اور حذر کیا جائے، اُس سے
 دُور بھاگا جائے، اُس کے کاروبار، اُس کے معاملات اس کی نعمتوں
 اور اس کی لذتوں اور زینتوں کو اپنے اُوپر حرام کر لیا جائے۔ یہ دُنیا انسان
 ہی کے لئے بنائی گئی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ اس کو برتے اور
 خوب برتے۔ مگر بُرے اور مہلے، پاک اور ناپاک، مناسب اور نامناسب
 کے فرق کو ملحوظ رکھ کر برتے۔ خدا نے اس کو آنکھیں دی ہیں اس لئے
 کہ وہ ان سے دیکھے۔ کان دیئے ہیں کہ ان سے سُنے۔ عقل دی ہے کہ
 اس سے کام لے۔ اگر وہ اپنے حواس، اپنے اعضاء اور اپنے قوائے
 ذہنی کو استعمال نہ کرے، یا استعمال کرے مگر غلط طریقہ سے تو اس
 میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔

دُنوی زندگی کا مال
 کہا گیا۔

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ
 الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغُرُوْمُ۔ (لقمان - ۴)

”آخرت کے متعلق اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ پس دُنیا کی
 زندگی تم کو دھوکہ میں نہ ڈال دے اور نہ فریب کار (شیطان) تم کو خدا
 سے بے فکر کرے۔“

وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهَا وَكَانُوا
مُجْرِمِينَ۔ (ہود۔ ۱۰)

”جن لوگوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا وہ ان دُنوی لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم تھے۔“

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا كَمَا أَنزَلْنَا
مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهَا نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ
هَشِيمًا تَذْرُوعًا الرِّيحَ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ
مُقْتَدِرًا۔ الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا
وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ
أَمَلًا۔ (الکہف۔ ۶)

”ان کے سامنے دُنوی زندگی کی مثال پیش کرو۔ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کی بدولت زمین کے برگ و بار گھنے ہو گئے۔ پھر آخر کار یہ سب نباتات بھوسہ ہو کر رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے لے پھرتی ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ مال اور اولاد محض دُنوی زندگی کی زینت ہیں۔ مگر تیرے رب کے نزدیک ثواب اور آئندہ کی توقع کے اعتبار سے باقی رہنے والی نیکیاں ہی زیادہ بہتر ہیں۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا
أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْخَاسِرُونَ۔ (المنافقون۔ ۲)

”اے ایمان لانے والو! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تم کو خدا کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے دراصل وہی ٹوٹے میں ہیں۔“

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ
عِندَنَا نَفْعًا إِلَّا مَنْ أَمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔

(سباہ-۵)

”تمہارے اموال اور تمہاری اولاد وہ چیزیں نہیں ہیں جو تم کو
ہم سے قریب کرنے والی ہوں۔ ہم سے قریب صرف وہ ہے جو ایمان
لایا اور جس نے نیک عمل کیا۔“

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُوَ
وَرِثَتُهُ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ
وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ أَغْبَبَ الْكُفَّاءَ نَبَاتُهُ
ثُمَّ يَهَيِّجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا۔

(الحمدید-۳)

”جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ایک کھیل ایک تماشاء، ایک ظاہری
شان ہے اور آپس میں تمہارا ایک دوسرے پر فخر کرنا، اور مال اولاد
میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی
ہے کہ بارش ہوئی، اس کی روئیدگی نے نافرمانوں کو خوش کر دیا۔ پھر
وہ پک گئی اور ٹوٹنے دیکھا کہ وہ زرد پڑ گئی، پھر آخر کار وہ بھوسہ ہو کر رہ
گئی۔“

اتَّبِنُونَ كُلٌّ رِيعَ آيَةٍ تَعْبَثُونَ وَتَتَّخِذُونَ
مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ۔ (الشعراء-۷)

”کیا تم ہر اونچی جگہ بے نتیجہ یادگاریں بناتے اور عمارتیں کھڑی
کرتے ہو؟ شاید کہ تمہیں ہمیشہ یہاں رہنا چاہیے !“

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هُمْ بِآمِنِينَ فِي جَدَّتِ وَعُيُونُ
وَدُّرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلَعُهَا هُضَيْمٌ، وَتَنْخَبُتُونَ مِنْ

الْجِبَالِ بُيُوتًا فَرِهِينَ۔ (الشعراء - ۸)

”کیا تم ان چیزوں میں جو یہاں ہیں اطمینان سے چھوڑ دیئے جاؤ گے؟ ان باغوں، ان چشموں، ان کھیتوں، ان نخلستانوں میں جن کے خوشے ٹوٹے پڑتے ہیں؟ تم پہاڑ کاٹ کاٹ کر گھر بنا رہے ہو اور خوش ہو۔“

إِنَّمَا تَكُونُوا يَدُ الرَّكْمِ الْمَوْتِ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي

بُزُوجٍ مُّشِيدَةً۔ (النساء - ۱۱)

”تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو آئے گی خواہ تم بڑے

مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔“

كُلُّ نَفْسٍ ذَا نِقْمَةٍ الْمَوْتِ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ۔

(العنکبوت - ۶)

”ہر ہستی کو موت آنی ہے۔ پھر تم سب ہماری طرف واپس

لائے جاؤ گے۔“

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا

لَا تُرْجَعُونَ۔ (المومنون - ۶)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو بے نتیجہ پیدا کیا ہے۔

اور تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے۔“

پہلے کہا گیا تھا کہ دنیا تمہارے لئے ہے، اور اسی لئے بنائی گئی ہے کہ تم اس کو خوب اچھی طرح برتو۔ اب معاملہ کا دوسرا رخ پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتایا جاتا ہے کہ مگر تم دنیا کے لئے نہیں ہو نہ اس لئے بنائے گئے ہو کہ یہ دنیا تمہیں برتے اور تم اسی میں اپنے آپ کو گم کر دو۔ دنیا کی زندگی سے دھوکا کھا کر کبھی یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہمیں دائمًا یہیں رہنا ہے۔ خوب یاد رکھو کہ یہ مال، یہ دولت، یہ شان و شوکت

کے سامان، سب ناپائدار ہیں۔ سب کچھ دیر کا بہلاوا ہیں۔ سب کا انجام موت ہے۔ اور تمہاری طرح یہ سب خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اس ناپائدار عالم میں سے اگر کوئی چیز باقی رہنے والی ہے تو وہ صرف نیکی ہے دل اور روح کی نیکی۔ عمل اور فعل کی نیکی۔

اعمال کی ذمہ داری اور جواب دہی

پھر کہا گیا:۔

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا لَتُبْذَرَنَّ كُلُّ
نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ۔ (طلہ-۱)

”فیصلہ کی گھڑی جس کو ہم چھپانے کا ارادہ رکھتے ہیں آنے والی ہے تاکہ ہر نفس کو اس کی سعی کے مطابق بدلہ ملے۔“

هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (النمل-۷)

”کیا تم کو تمہارے عملوں کے سوا کسی اور چیز کے لحاظ سے جزا

دی جائے گی؟

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ وَأَنَّ سَعْيَهُ
سَوْفَ يُرَىٰ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ وَأَنَّ إِلَىٰ
رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ۔ (النجم-۳)

”اور یہ کہ انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی ہے اور اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی پھر اس کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔ اور یہ کہ آخر کار سب کو تیرے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔“

وَمَنْ كَانَ فِي هَذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ
أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا۔ (بنی اسرائیل-۸)

”جو اس دنیا میں اندھا تھا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ اور

وہ براہ راست سے بہت ہٹا ہوا ہے۔“

وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوا
عِنْدَ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (البقرہ-۱۳)

”تم اپنے لئے جو نیکیاں اس دنیا سے بھیجو گے انہیں اللہ کے
ہاں پاؤ گے، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُسے دیکھتا ہے۔“

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ
تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔

(البقرہ-۳۸)

”اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کے پاس واپس کیے جاؤ گے
پھر ہر نفس کو اس کے کئے کا بدلہ ملے گا اور اُن پر ہرگز ظلم نہ کیا
جائے گا۔“

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا
وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ۔

”وہ دن جب کہ ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکی اور اپنی کی ہوئی
بدی کو حاضر پائے گا۔“

وَالْوَنَرُنْ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ
فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا
يُظْلِمُونَ۔ (الاعراف-۱)

”اس دن اعمال کا تولا جانا برحق ہے۔ جن کے اعمال کا پلڑا
بھاری ہوگا۔ وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کے اعمال
کا پلڑا ہلکا ہوگا۔ وہی لوگ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والے
ہوں گے کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔“

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (الزلزال)

”پس جو شخص ذرہ برابر نیک عمل کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے
گا اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرے گا اس کا نتیجہ بھی دیکھ لے گا۔“
فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ
عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى۔ (آل عمران - ۲۰)

”اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور کہا کہ میں تم میں سے کسی عمل
کرنے والے کا عمل ضائع نہ کروں گا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔“
وَالْفُقُوۡا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّآتِيَ
اَحَدَكُمْ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْ اِلٰى
اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصْدَقَ وَاَكُنْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ
يُؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا اَجَآءَ اَجَلُهَا۔ (النافقون - ۲)

”ہم نے تم کو جو کچھ بخشا ہے اس میں سے خرچ کر دو قبل اس کے
کہ تم میں سے کسی کو موت آئے اور وہ کہے کہ میرے رب! کاش تو
مجھے تھوڑی مہلت اور دیتا تو میں تیرے راستے میں خرچ کرتا اور نیکو
کاروں میں سے ہوتا۔ مگر اللہ کسی نفس کی مدت مقررہ کن پہنچنے کے
بعد پھر اس کو مہلت ہرگز نہیں دیتا۔“

وَلَوْ تَرَىٰ اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوۡا رُءُوۡسِهِمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا ابْصُرْنَا وَسَلِّعْنَا فَاِمَّا يَسْتَعْجِلُ
نَعْمَلُ صَالِحًا اِنَّا مُوَقِّنُوْنَ فَذُوقُوۡا
بِمَا نَسِيتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا اِنَّا نَسِيْنٰكُمْ
وَذُوقُوۡا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ه

”کاش تم وقت دیکھتے جب مجرم اپنے رب کے سامنے سر جھکائے کھڑے ہوں گے اور کہیں گے کہ پروردگار ہم نے اب دیکھ لیا اور سُن لیا اب تو ہمیں واپس کر دے ہم اچھے عمل کریں گے۔ اب ہم کو ایقان حاصل ہو گیا ہے..... مگر کہا جائے گا کہ اب اس کوتاہی کا مزہ چکھو کہ تم نے اس دن ہمارے پاس حاضر ہونے کو بھلا دیا، اب ہم بھی تم کو بھلا چکے ہیں۔ پس اب ہمیشگی کے عذاب کا مزہ چکھو ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے۔“

یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ دُنیا دارِ العمل ہے۔ سعی اور کوشش کی جگہ ہے۔ اور آخرت کی زندگی دارِ الجزا ہے۔ نیکی اور بدی کے پھل اور اعمال کے بدلے کا گھر ہے۔ انسان کو موت کی گھڑی تک دُنیا میں عمل کرنے کی مہلت ملی ہوئی ہے۔ اس کے بعد اسے پھر عمل کی مہلت ہرگز نہ ملے گی۔ لہذا اس عرصہ حیات میں اس کو یہ سمجھ کر سعی کرنی چاہیے کہ میرا ہر کام، میری ہر حرکت، میری ہر بُرائی اور بھلائی اپنا ایک اثر رکھتی ہے، ایک وزن رکھتی ہے، اور اس اثر اور وزن کے مطابق مجھے بعد کی زندگی میں اچھا یا بُرا نتیجہ ملنے والا ہے۔ مجھے جو کچھ ملے گا وہ میری یہاں کی کوشش اور میرے یہاں کے عمل کا بدلہ ہوگا۔ نہ میری کوئی نیکی ضائع ہوگی اور نہ کوئی بدی سزا سے بچے گی۔

انفرادی ذمہ داری

اس ذمہ داری کے احساس کو مزید تقویت دینے کے لیے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ہر شخص خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس کی ذمہ داری میں شریک ہے، اور نہ کوئی شخص کسی کو اس کے نتائج عمل سے بچا سکتا ہے۔

عَلَيْكُمْ أَنْفُسُكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ

إِذَا أَهْتَدَيْتُمْ - (المائدہ - ۱۴)

”تم پر تمہارے اپنے نفس کی ذمہ داری ہے۔ اگر تم ہدایت پاؤ تو دوسرا گمراہ ہونے والا تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى - (الانعام - ۲۰)

”ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔“

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ - (الممتحنہ - ۱)

”قیامت کیدن تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد ہرگز کام نہ آئے گی۔ تمہارے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ اور اس کی نظر تمہارے عملوں پر ہے۔“

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا - (بنی اسرائیل - ۱)

”اگر تم نیک کام کرو گے تو اپنے نفس کے لئے کرو گے اور اگر بُرے کام کرو گے تو اسی کے لئے۔“

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى وَأَنْ شَاءَ عِزُّ مُّقْلَتٍ إِلَى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلُ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَى - (فاطر - ۳)

”کوئی شخص کسی دوسرے کا بار گناہ اپنے سر نہ لے گا۔ اور اگر کسی پر گناہوں کا بڑا بار ہو اور وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کو بلائے تو وہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اپنے اوپر نہ لے گا، خواہ وہ

رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ وَاحْشَوْا يَوْمَ مَا لَا
يَجْزِي وَالِدٌ عَنْ وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَانِبُ عَنْ
وَالِدِهِ شَيْئًا۔ (لقمان - ۲)

”اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جب
کہ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کے
کچھ کام آسکے گا۔“

مَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا
فَلَا نَفْسَ لَهُمِ يَهْدُوا نَ۔ (الروم - ۵)

”جس نے کفر کیا اس کے کفر کا وبال اس کے سر ہے اور جس
نے نیک عمل کیا تو ایسے لوگ خود اپنی بہتری کے لئے راستہ صاف کر
رہے ہیں۔“

یہاں ہر انسان پر فرداً فرداً اس کے تمام اچھے اور بُرے اعمال
کی کامل ذمہ داری کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔ نہ یہ اُمید باقی رہنے دی
گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا،
نہ اس توقع کے لئے کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور
کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کی پاداش سے بچ جائیں گے، اور
نہ اس خطرہ کا کوئی موقع باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسنِ عمل
پر اثر انداز ہوگا، یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت
نامقبولیت میں کوئی دخل ہے جس طرح آگ میں ہاتھ ڈالنے والے کو جلنے
سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی، اور شہد کھانے والے کو شیرینی کے احساس
سے کوئی شے نہیں روک سکتی، نہ جلنے کی مضرت میں کوئی دوسرا شخص
اس کا شریک و سہم ہو سکتا ہے اور نہ شیرینی کی لذت سے کوئی دوسرا

اس کو محروم کر سکتا ہے، اسی طرح بدکاری کے نتیجہ بد اور نیکو کاری کے انجام نیک میں بھی ہر شخص بجائے خود منفرد ہے۔ لہذا دنیا کو برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں، بُرائی کا وبال بھی تنہا میرے اوپر ہے، اور بھلائی کا فائدہ بھی اکیلا میں اٹھانے والا ہوں۔

اوپر اسلام کے تصور حیاتِ دنیا کی جو تحلیل کی گئی ہے اس سے وہ تمام اجزاء آپ کے سامنے آگئے ہیں جن سے یہ تصور مرکب ہے۔ اب تحلیل و تجزیہ کے پہلو کو چھوڑ کر ترکیب و تالیف کے پہلو پر نظر ڈالیے اور یہ دیکھئے کہ ان متفرق اجزاء کے ملنے سے جو کلی تصور حاصل ہوتا ہے وہ کس حد تک فطرت اور واقعہ کے مطابق ہے؟ اور دنیوی زندگی کے متعلق دوسری تہذیبوں کے تصورات کی نسبت سے اس کا کیا مرتبہ ہے؟ اور اس تصور حیات پر جس تہذیب کی بنیاد قائم ہے وہ انسان کے فکر و عمل کو کس سانچے میں ڈھالتی ہے؟

زندگی کا فطری تصور

تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن کو تمام ان تصورات سے جو دنیا اور حیاتِ دنیا کے متعلق مذاہب نے پیش کیے ہیں خالی کر کے ایک مبصر کی حیثیت سے اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نگاہ ڈالیے اور خود کیجئے کہ اس پورے ماحول میں آپ کی حالت کیا ہے۔ اس مشاہدہ میں آپ کو چند باتیں واضح طور پر نظر آئیں گی۔

آپ دیکھیں گے کہ جتنی قوتیں آپ کو حاصل ہیں ان کا دائرہ محدود ہے۔ آپ کے حواس جن پر آپ کے علم کا انحصار ہے آپ کے قریبی ماحول کی حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ آپ کے جوارح جن پر

آپ کے عمل کا انحصار ہے بہت تھوڑی سی اشیاء پر دسترس رکھتے ہیں۔ آپ کے گرد و پیش بے شمار ایسی چیزیں ہیں جو آپ سے جسم اور طاقت میں بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کی ہستی نہایت حقیر اور کمزور نظر آتی ہے۔ دُنیا کے اس بڑے کارخانے میں جو زبردست قوتیں کار فرما ہیں ان میں سے کوئی بھی آپ کے دستِ قدرت میں نہیں ہے۔ اور آپ ان قوتوں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ جسمانی حیثیت سے آپ ایک متوسط درجے کے ہستی رکھتے ہیں جو اپنے سے چھوٹی چیزوں پر غالب اور اپنے سے بڑی چیزوں سے مغلوب ہے۔

لیکن ایک اور قوت آپ کے اندر ایسی ہے جس نے آپ کو ان تمام چیزوں پر شرف عطا کر دیا ہے۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنی جنس کے تمام حیوانات پر قابو پا لیتے ہیں اور ان کی جسمانی طاقتوں کو جو آپ کی جسمانی طاقت سے بہت بڑھی ہوئی ہیں مغلوب کر لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے گرد و پیش کی چیزوں میں تصرف کرتے ہیں اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق خدمت لیتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ طاقت کے نئے نئے خزانوں کا پتہ چلاتے ہیں اور ان کو نکال نکال کر نئے نئے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ اسی قوت کی بدولت آپ اپنے وسائل اکتسابِ علم کو وسعت دیتے ہیں اور ان چیزوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو آپ کے طبعی قوے کی دسترس سے باہر ہیں۔ غرض ایک قوت ہے جس کی بدولت تمام دُنیا کی چیزیں آپ کی خادم بن جاتی ہیں اور آپ ان کے مخدوم ہونے کی مزیت حاصل کرتے ہیں۔

پھر کارگاہِ ہستی کی وہ بالاتر قوتیں بھی جو آپ کے دستِ قدرت

میں نہیں ہیں، اس ڈھنگ پر کام کر رہی ہیں کہ بالعموم وہ آپ کی دشمن و مخالفت نہیں بلکہ آپ کی مددگار اور آپ کے مفاد و مصلحت کی تابع ہیں ہوا، پانی، روشنی، حرارت، اور ایسی ہی دوسری قوتیں جن پر آپ کی زندگی کا انحصار ہے، کسی ایسے نظام کے ماتحت عمل کر رہی ہیں جس کا مقصد آپ کی مساعدت کرنا ہے، اور اسی بنا پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب آپ کے لئے مسخر ہیں۔

اپنے اس ماحول پر جب آپ ایک عمیق نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کو ایک زبردست قانون کا رفرمانظر آتا ہے جس کی گرفت میں حقیر ترین ہستیوں سے لے کر عظیم ترین ہستیاں تک یکساں جکڑی ہوئی ہیں اور جس کے ضبط و نظم پر تمام عالم کے بقا کا انحصار ہے۔ آپ خود بھی اس قانون کے تابع ہیں۔ مگر آپ میں اور دوسری اشیاء عالم میں ایک بڑا فرق ہے۔ دوسری تمام چیزیں اس قانون کے خلاف حرکت کرنے پر ذرہ برابر قدرت نہیں رکھتیں۔ لیکن آپ کو اس کے خلاف چلنے کی قدرت حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب آپ اس کے خلاف چلنا چاہتے ہیں تو وہ قانون اس خلاف ورزی میں بھی آپ کی مساعدت کرتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر ایسی خلاف ورزی اپنے ساتھ کچھ مضرتیں رکھتی ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اس کی مخالفت کرنے کے بعد اس کے بُرے اثرات سے بچ جائیں۔

اس عالمگیر اور اٹل قانون کے تحت دُنیا میں کون و فساد کے مختلف مظاہر آپ کو نظر آتے ہیں۔ تمام عالم میں بننے اور بگڑنے کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ جس قانون کے تحت ایک چیز کو پیدا اور پرورش کیا جاتا ہے اسی قانون کے تحت اس کو مٹایا اور ہلاک بھی کر دیا جاتا ہے دُنیا کی کوئی شے اس قانون کے نفاذ سے محفوظ نہیں ہے۔

نظام ہر جو چیزیں اس سے محفوظ نظر آتی ہیں اور جن پر استمرار و دوام کا شبہ ہوتا ہے اُن کو بھی جب آپ تعمق کی نظر سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حرکت و تغیر کا عمل ان میں بھی جاری ہے اور کون و فساد کے چکر سے ان کو بھی نجات حاصل نہیں ہے۔ چوں کہ کائنات کی دوسری چیزیں شعور و ادراک نہیں رکھتیں یا کم از کم ہم کو اس کا علم نہیں ہے، اس لئے ہم ان کے اندر اس بننے اور بگڑنے سے کسی لذت اور الم کا اثر محسوس نہیں کرتے۔ اور اگر انوارِ حیوانی میں اس کا اثر محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ بہت محدود ہوتا ہے لیکن انسان جو ایک صاحب شعور و ادراک ہستی ہے اپنے گرد و پیش ان تغیرات کو دیکھ کر لذت اور الم کے شدید اثرات محسوس کرتا ہے۔ کبھی مناسب طبع امور سے اس کی لذت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو بھول جاتا ہے کہ اس دُنیا میں فساد بھی ہے اور کبھی مخالف امور سے اس کا الم اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ اس دُنیا میں اسے نہ افساد ہی فساد نظر آنے لگتا ہے۔ اور وہ بھول جاتا ہے کہ یہاں گون بھی ہے۔

مگر خواہ آپ کے اندر لذت اور الم کے کیسے ہی متضاد احساسات ہوں اور ان کے زیر اثر دنیوی زندگی کے متعلق آپ کا نظریہ کتنا ہی افراط یا تفریط کی طرف مائل ہو، بہر حال آپ اپنی جبلت سے مجبور ہیں کہ اس دُنیا کو جیسی بھی ہے، عملاً بریں اور ان قوتوں سے جو آپ کے اندر موجود ہیں کام لیں۔ آپ کی جبلت میں زندہ رہنے کی خواہش موجود ہے، اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے آپ کے اندر بھوک کی ایک زبردست قوت رکھ دی گئی ہے، جو دائماً آپ کو عمل پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ فطرت کا قانون آپ کی نوع کے

استمرار کے لئے آپ سے خدمت لینا چاہتا ہے اور اس کے لئے اس نے شہوت کی ایک ناقابل دفع قوت آپ کے اندر رکھ دی ہے جو آپ سے اپنا مقصد پورا کر کے ہی چھوڑتی ہے۔ اسی طرح آپ کی جبلت میں کچھ دوسرے مقاصد کے لئے کچھ اور قوتیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ اور وہ سب آپ سے بزور اپنا کام لے لیتی ہیں۔ اب یہ آپ کی اپنی فراست و دانائی پر موقوف ہے کہ فطرت کے ان مقاصد کی خدمت اچھے طریقے سے انجام دیں یا بُرے طریقے سے، بطیب نفس انجام دیں یا بجبر و اکراہ۔ یہی نہیں بلکہ خود فطرت ہی نے مخصوص طور پر آپ کو یہ قدرت بھی عطا کی ہے کہ ان مقاصد کی خدمت انجام دیں یا نہ دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس فطرت کا قانون یہ بھی ہے کہ اس کی خدمت بجا لانا اور اچھے طریقے سے بطیب نفس بجا لانا آپ کے لئے مفید ہوتا ہے، اور اگر آپ اس سے روگردانی کریں، یا اگر اس کی متابعت کریں بھی تو بُری طرح کریں، تو یہ خود آپ ہی کیلئے مضر ہوتا ہے۔

مختلف مذاہب کے تصورات

ایک صحیح الفطرت اور وسیع النظر آدمی جب دُنیا پر نظر ڈالے گا اور اس دُنیا کی نسبت سے اپنی حالت پر غور کرے گا، تو وہ تمام پہلو اس کی نگاہ کے سامنے آجائیں گے جو اوپر بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن نوع انسانی کے مختلف گروہوں نے اس مرقع کو مختلف گوشوں سے دیکھا ہے، اور اکثر ایسا بھولے ہیں کہ جس کو جو پہلو نمایاں نظر آیا اس نے حیاتِ دُنیا کے متعلق اسی پہلو کے لحاظ سے ایک نظریہ قائم کر لیا اور دوسرے پہلوؤں پر نگاہ ڈالنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

مثال کے طور پر ایک گروہ نے انسان کی کمزوری اور بے بسی اور اس کے مقابلہ میں فطرت کی بڑی بڑی طاقتوں کی شوکت و جبروت کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ دُنیا میں وہ ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے، اور یہ نافع و ضار قوتیں جو دُنیا میں نظر آتی ہیں کسی عالمگیر قانون کی تابع نہیں ہیں بلکہ خود مختار یا نیم خود مختار طاقتیں ہیں۔ یہ تخیل ان کے ذہن پر اتنا غالب ہوا کہ وہ پہلو جس سے تمام کائنات پر انسان کو شرف و مزیت حاصل ہے، ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اپنی ہستی کے روشن پہلو کو بھول گئے اور اپنی عزت بزرگی کے احساس کو انہوں نے اپنی کمزوری و ناتوانی کے مبالغہ آمیز اعتراف پر قربان کر دیا۔ بُت پرستی، شجر پرستی، ستارہ پرستی، اور دوسرے قوائے فطرت کی پرستش اسی نظریہ کی پیداوار ہے۔

ایک دوسرے گروہ نے دُنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں بس فساد ہی فساد ہے۔ تمام کارخانہ ہستی اس لئے چل رہا ہے کہ انسان کو تکلیف اور رنج و الم پہنچائے۔ دُنیا کے جتنے تعلقات اور روابط ہیں سب انسان کو پریشانیوں اور مصیبتوں میں پھانسنے والے پھندے ہیں۔ ایک انسان پر ہی کیا موقوف ہے، تمام کائنات افسردگی اور ہلاکت کے پنجے میں گرفتار ہے۔ یہاں جو کچھ بنتا ہے بگڑنے کے لئے بنتا ہے۔ بہار اس لئے آتی ہے کہ خزاں اس کا چمن لوٹ لے۔ زندگی کا شجر اس لئے برگ و بار لاتا ہے کہ موت کا عفریت اس سے لطف اندوز ہو۔ بقا کا جمال سنور سنور کر اس لئے آتا ہے کہ فنا کے دیوتا کو اس سے کھیلنے کا خوب موقع ملے۔ اس تخیل نے ان لوگوں کے لئے دُنیا اور اس کی زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ چھوڑی اور انہوں نے اپنے لئے نجات کی راہ بس اسی میں دیکھی کہ

دُنیا سے کنارہ کش ہو جائیں، نفس کشی اور ریاضت سے اپنے تمام احساسات کو باطل کر دیں، اور فطرت کے اُس ظالم قانون کو توڑ ڈالیں جس نے محض اپنے کارخانے کو چلانے کے لیے انسان کو آلہ کار بنایا ہے۔

ایک اور گروہ نے اس دُنیا کو اس نظر سے دیکھا کہ اس میں انسان کے لیے لذت و عیش کے سامان فراہم ہیں اور اس کو ایک تھوڑی سی مدت ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے مل گئی ہے۔ تکلیف اور الم کا احساس ان لذتوں کو بدمزہ کر دیتا ہے۔ اگر انسان اس احساس کو باطل کر دے، اور کسی چیز کو اپنے لیے موجب الم اور باعث تکلیف نہ رہنے دے، تو یہاں پھر لطف ہی لطف ہے۔ آدمی کے لیے جو کچھ بھی ہے یہی دُنیا ہے اور اس کو جو کچھ مزے اُڑانے ہیں اسی دُنوی زندگی میں اُڑانے ہیں۔ موت کے بعد نہ وہ ہوگا، نہ دُنیا ہوگی، نہ اس کی لذتیں ہوں گی، سب کچھ نسیا نسیا ہو جائے گا۔

اس کے مقابلہ میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو دُنیا اور اس کی لذتوں اور مسترتوں بلکہ خود دُنوی زندگی ہی کو سراسر گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی رُوح کے لیے دُنیا کی مادی آلائشیں ایک نجاست اور ایک ناپاکی کا حکم رکھتی ہیں۔ اس دُنیا کو برتنے اور اس کے کاروبار میں حصہ لینے اور اس کی لذتوں اور مسترتوں سے لطف اندوز ہونے میں انسان کے لیے کوئی پاکیزگی اور کوئی صلاح اور خیر نہیں ہے جو شخص انسانی بادشاہت سے بہرہ مند ہونا چاہتا ہو اسے دُنیا سے الگ تھلک رہنا چاہیے۔ اور جو دُنیا کی دولت و حکومت اور دُنوی زندگی کا لطف اٹھانا چاہتا ہو اسے یقین رکھنا چاہیے کہ آسمانی بادشاہت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر جب اس گروہ نے محسوس کیا

کہ انسان اس دُنیا کو برتنے اور اس کے دھندوں میں پھنسنے کے لئے اپنی جبلت سے مجبور ہے، اور آسمانی بادشاہت میں داخل ہونے کا خیال خواہ کتنا ہی دلفریب ہو، مگر وہ اتنا قوی نہیں ہو سکتا کہ انسان اس کے بل پر اپنی فطرت کے اقتضاء کا مقابلہ کر سکے، تو انہوں نے آسمانی بادشاہت تک پہنچنے کے لئے ایک قریب کا راستہ نکال لیا، اور وہ یہ تھا کہ ایک مستی کے کفارے نے اُن سب لوگوں کو ان کے اعمال کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا ہے جو اس مستی پر ایمان لے آئیں۔

ایک اور گروہ نے قانونِ فطرت کی ہمہ گیری کو دیکھ کر انسان کو ایک مجبورِ محض، مستی سمجھ لیا۔ اس نے دیکھا کہ نفسیات، عضویات، حیاتیات اور قانونِ توریت کی شہادتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان ہرگز کوئی مرید و مختار مستی نہیں ہے۔ فطرت کے قانون نے اس کو بالکل جکڑ رکھا ہے۔ وہ اس قانون کے خلاف نہ کچھ سوچ سکتا ہے، نہ کسی چیز کا ارادہ کر سکتا ہے، اور نہ کوئی حرکت کرنے پر قادر ہے۔ لہذا اس پر اپنے کسی فعل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

اس کے بالکل برعکس ایک گروہ کی نگاہ میں انسان نہ صرف ایک صاحبِ ارادہ مستی ہے، بلکہ وہ کسی بالاتر ارادہ کا تابع اور کسی باعلیٰ طاقت کا مطیع و فرمانبردار نہیں ہے اور نہ اپنے اعمال و افعال میں خود اپنے ضمیر یا انسانی حکومت کے قانون کے سوا کسی کے آگے جوابدہ ہے۔ وہ اس دُنیا کا مالک ہے۔ دُنیا کی سب چیزیں اس کے لئے مستخر ہیں۔ اسے اختیار ہے کہ ان کو جس طرح چاہے برتے۔ اس نے اپنی زندگی کو بہتر بنانے اور اپنے اعمال و افعال میں ایک ضبط و نظم پیدا کرنے کے لئے اپنی حیاتِ انفرادی پر خود ہی پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ مگر اجتماعی

حیثیت سے وہ بالکل مطلق العنان ہے اور کسی بالاتر ہستی کے آگے مسئول ہونے کا تخیل سراسر لغو ہے۔

یہ دُنیوی زندگی کے متعلق مختلف مذاہب فکر و رائے کے مختلف تصورات ہیں۔ اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جن پر مختلف تہذیبوں کی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔ ہر تہذیب کی عمارت میں جو مختلف طرز و انداز ہم کو نظر آ رہے ہیں ان کے ایک مخصوص اور جداگانہ ہیئت اختیار کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ ان کی بنیاد میں دُنیوی زندگی کا ایک خاص تصور ہے جو اس مخصوص ہیئت کا مقتضی ہوا ہے۔ اگر ہم ان میں سے ہر ایک کی تفصیلات پر نظر ڈال کر یہ تحقیق کریں کہ اس نے کس طرح ایک خاص طرز و انداز کی تہذیب پیدا کی ہے تو یہ یقیناً ایک دلچسپ بحث ہوگی۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہے، کیونکہ ہم صرف اسلامی تہذیب کی خصوصیات کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ زندگی کے یہ جتنے تصورات آپ کے سامنے بیان ہوئے ہیں۔ یہ سب دُنیا کو ایک خاص گوشہ نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہیں۔ ان میں سے کوئی تصور ایسا نہیں ہے جو مجموعی حیثیت سے تمام کائنات پر ایک کلی نگاہ ڈالنے اور موجوداتِ عالم میں انسان کے صحیح حیثیت متعین کرنے کے بعد قائم کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر تصور ہماری نظر میں باطل ہو جاتا ہے جب ہم اس کے زاویہ نگاہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے دُنیا کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر دُنیا کے کلی ملاحظہ کے بعد تو ان تمام ہی تصورات کی غلطی ہم پر روشن ہو جاتی ہے۔

اسلامی تصور کی خصوصیت

اب یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ زندگی کے تمام تصورات میں صرف اسلام ہی کا تصور ایک ایسا تصور ہے جو فطرت اور حقیقت

کے مطابق ہے، اور جس میں دُنیا اور انسان کے تعلق کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو دُنیا کوئی ترک اور نفرت کے قابل چیز ہے۔ اور نہ ایسی چیز ہے کہ انسان اس کا فریفتہ ہو اور اس کی لذتوں میں گم ہو جائے۔ نہ وہ سراسر کون ہے نہ سراسر فساد۔ نہ اس سے اجتناب درست ہے اور نہ اس میں کئی انہماک صحیح۔ نہ وہ بالکل نجاست و آلودگی ہے اور نہ تمام تر پاکیزگی و طہارت۔ پھر اس دُنیا سے انسان کا تعلق نہ اُس قسم کا ہے جیسا ایک بادشاہ کا اپنی مملکت سے ہوتا ہے اور نہ اُس قسم کا جیسا ایک قیدی کا اپنے قید خانے سے نہ انسان اتنا حقیر ہے کہ دُنیا کی ہر قوت اس کی مسجود ہو اور نہ اتنا غالب و قاهر کہ وہ دُنیا کی ہر شے کا مسجود بن جائے۔ نہ وہ اتنا بے بس ہے کہ اس کا ذاتی ارادہ کوئی چیز ہی نہ ہو اور نہ اتنا طاقت ور کہ بس اسی کا ارادہ سب کچھ ہو۔ نہ وہ عالم ہستی کا مطلق العنان فرماں روا ہے اور نہ کروڑوں آقاؤں کا بیچارہ غلام۔ حقیقت جو کچھ ہے وہ ان مختلف اطراف و نہایات کے درمیان ایک متوسط حالت ہے۔

یہاں تک تو فطرت اور عقل سلیم ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ لیکن اسلام اس سے آگے بڑھتا ہے اور اس امر کا ٹھیک ٹھیک تعین کرتا ہے۔ کہ دُنیا میں انسان کا حقیقی مرتبہ کیا ہے؟ انسان اور دُنیا کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے؟ اور انسان دُنیا کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ وہ یہ کہہ کر انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے کہ تو عام مخلوقات کی طرح نہیں ہے بلکہ روئے زمین پر رب العالمین کا ذمہ دار و اُسرا ہے۔ دُنیا اور اس کی طاقتوں کو تیرے لئے مستخر کیا گیا ہے۔ تو سب کا حاکم اور ایک کا محکوم ہے۔ سب کا فرماں روا اور صرف ایک کا تابع فرمان ہے۔ تجھے تمام مخلوقات پر عزت و شرف حاصل ہے، مگر عزت کا

استحقاق تھے اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب تو اُس کا مطیع اور فرمانبردار ہو اور اُس کے احکام کا اتباع کرے جس نے تجھے نیابت کا منصب عطا کر کے دُنیا پر شرف بخشا ہے۔ دُنیا میں تو اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اس کو برتے اور اس میں تصرف کرے۔ پھر تو اس دُنیا کی زندگی میں حیطہ صیح یا غلط عمل کرے گا اس پر وہ اچھے یا بُرے نتائج مُرتب ہوں گے جنہیں تو بعد کی زندگی میں دیکھے گا۔ لہذا دُنوی زندگی کی اِس تصور سی مدت میں تجھ کو اپنی شخصی ذمہ داری اور مسئولیت کا ہر لمحہ احساس رہنا چاہیئے، اور کبھی اس سے غافل نہ ہونا چاہیئے کہ جو چیزیں ربُّ العالمین نے اپنے نائب کی حیثیت سے تیری امانت میں دی ہیں اُن سب کا تجھ سے پورا پورا حساب لیا جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تصور اپنے جزئیات کے ساتھ ہر مسلمان کے ذہن میں حاضر نہیں ہے، اور نہ اہل علم کے مخصوص گروہ کے سوا کوئی ان جزئیات کا واضح ادراک رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ تصور اسلامی تہذیب کی زین و بنیاد میں متمکن ہے۔ اس لیے مسلمان کی سیرت اپنی اصلی شان اور اپنی حقیقی خصوصیات سے بہت کچھ عاری ہو جانے کے باوجود آج بھی اُس کے اثرات سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسلمان جس نے اسلامی تہذیب کے ماحول میں تربیت پائی ہو، اس کا عمل خواہ بیرونی اثرات سے کتنا ہی ناقص ہو گیا ہو، لیکن خود داری و عزت نفس کا احساس، خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا، خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا، خدا کے سوا کسی کو اپنا مالک اور آقا نہ سمجھنا، دُنیا میں اپنے آپ کو شخصاً مسئول سمجھنا، دُنیا کو دارُ العمل اور آخرت کو دارُ الجزا سمجھنا، صرف اپنے ذاتی اعمال کے حُسن و قبح پر اپنی آخرت کی کامیابی و ناکامی کو منحصر سمجھنا، دُنیا اور اس کی دولت و لذت کو ناپائیدار اور صرف

اپنے اعمال اور ان کے نتائج کو باقی و دائم خیال کرنا، یہ ایسے امور ہیں جو اس کے رگ و پے میں سرایت کیئے ہوئے ہوں گے اور ایک عمیق النظر مبصر اس کی باتوں اور اس کی حرکات و سکنات میں اس عقیدے کے اثرات (خواہ وہ کتنے ہی دھندلے کیوں نہ ہوں) صاف محسوس کر لے گا جو اس کی رُوح اور اس کے دل کی گہرائیوں میں اُترا ہوا ہے۔

پھر جو شخص تہذیب اسلام کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا اسے یہ بات نمایاں طور پر محسوس ہوگی کہ اس میں جب تک خالص اسلامیت رہی اس وقت تک یہ ایک خالص عملی تہذیب تھی۔ اس کے پیروؤں کے نزدیک دُنیا آخرت کی کھیتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دُنیا میں جتنی مدت وہ زندہ رہیں اس کا ہر لمحہ اس کھیتی کے بونے اور جوتے میں صرف کر دیں اور زیادہ سے زیادہ تخم ریزی کریں تاکہ بعد کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ فصل کاٹنے کا موقع ملے۔ انہوں نے رہبانیت اور لذتیت کے درمیان ایک ایسی معتدل اور متوسط حالت میں دُنیا کو برتنا جس کا نام و نشان بھی ہم کو کسی دوسری تہذیب میں نظر نہیں آتا۔ خلافتِ الہی کا تصور ان کی دُنیا میں پوری طرح منہمک ہونے اور اس کے معاملات کو انتہائی سرگرمی کے ساتھ انجام دینے پر ابھارتا تھا، اور اس کے ساتھ مسئولیت اور ذمہ داری کا خیال انہیں حد سے متجاوز بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ ناسپِ خدا ہونے کی وجہ سے انتہا درجہ کے خوددار تھے، اور پھر یہی تصور ان میں تکبر اور غرور کی پیدائش کو روکتا بھی تھا۔ وہ خلافت کے فرائض انجام دینے کے لئے اُن تمام چیزوں کی طرف رغبت رکھتے تھے جو دُنیا کا کام چلانے کے لئے ضروری ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی اُن چیزوں کی طرف ان کو کوئی رغبت نہ تھی۔

جو دنیا کی لذتوں میں گم کر کے انسان کو اس کے فرائض سے غافل کر دینے والی ہیں۔ غرض وہ دنیا کے کام کو اس طرح چلاتے تھے کہ گویا انہ کو ہمیشہ یہیں رہنا ہے، اور پھر اس کی لذتوں میں منہمک ہونے سے اس طرح بچے رہتے تھے کہ گویا دنیا ان کے لئے ایک سرائے ہے جہاں محض عارضی طور پر وہ مقیم ہو گئے ہیں۔

بعد میں جب اسلامیت کا اثر کم ہو گیا اور دوسری تہذیبوں سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی سیرت میں پوری اسلامی شان باقی نہیں رہی تو انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو دنیوی زندگی کے اسلامی تصور کے خلاف تھا۔ عیش و عشرت میں منہمک ہوئے۔ عالی شان قصر تعمیر کئے۔ موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ میں دلچسپی لی۔ معاشرت اور طرزِ بود و ماند میں اُس اسراف اور اُس شان و شکوہ کو اختیار کیا جو اسلامی مذاق کے بالکل خلاف تھی۔ حکومت و سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات میں وہ طریقے اختیار کر لئے جو بالکل غیر اسلامی تھے۔ مگر اس کے باوجود دنیوی زندگی کا اسلامی تصور، جو اُن کے دل میں اُترا ہوا تھا، کہیں نہ کہیں اپنا اثر نمایاں کر کے رہتا تھا اور یہی اثر ان کے اندر دوسروں کے مقابلے میں ایک امتیازی شان پیدا کر دیتا تھا۔ ایک مسلمان بادشاہ جتنا کے کنارے ایک عالی شان قصر تعمیر کرتا ہے اور اس میں لطف و تفریح اور شان و شوکت کے وہ تمام سامان فراہم کرتا ہے جن کا انسان اس زمانہ میں تصور کر سکتا تھا۔ مگر اس قصر کی سب سے زیادہ پُر لطف تفریح گاہ میں پشت کی جانب (یعنی قبلہ کے رخ پر) یہ رُبا بھی کندہ کرتا ہے۔

اے بندِ پائے و قفلِ بردل ہشدار

وے دوختہ چشم و پائے در گل ہشدار

عزم سفر مغرب و رودر مشرق

اے راہِ روپشت بمنزل ہبشار

وہ قصر اپنی جگہ بے نظیر نہیں ہے۔ اس سے بہتر قصر دُنیا کی دوسری قوموں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اس تخیل کی مثال دُنیا کی کسی قوم میں نہیں مل سکتی۔ جو روئے زمین پر فردوس بنانے والے کو ”اے راہِ روپشت بمنزل ہبشار“ کی تنبیہ کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں بکثرت ملیں گی کہ قیصر و کسریٰ کے نمونوں پر بادشاہی کرنے والوں نے بھی جب کسی دشمن پر فتح پائی تو اپنی کبریائی کا اظہار کرنے کے بجائے خُدا کے واحد کے سامنے خاک پر سر بسجود ہو گئے۔ بڑے بڑے جابر و گردن کش فرماں رواؤں نے جب شریعتِ اسلامی کے خلاف عمل کرنا چاہا تو کسی بندہ خُدا نے ان کو بزمِ ملا ٹوک دیا اور وہ خوفِ خُدا سے کانپ اُٹھے۔ انتہا درجہ کے بد عمل اور سیہ کار لوگوں کو کسی ایک معمولی بات سے تنبیہ ہو گئی اور دفعتاً ان کی زندگی کا رنگ بدل گیا۔ دولتِ دُنیا پر جان فدا کرنے والوں کے دل میں دُنیا کی ناپائیداری اور آخرت کے حساب کتاب کا خیال آیا اور انہوں نے خُدا کے بندوں پر سب کچھ تقسیم کر کے ایک مقصدانہ زندگی اختیار کر لی۔ غرض اُن تمام غیر اسلامی اثرات کے باوجود، جو مسلمانوں کی زندگی میں پھیل گئے ہیں، آپکو ہر قدم پر اُن کی قومی سیرت میں اسلامی تصور کا جلوہ کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آئے گا اور اس کو دیکھ کر آپ ایسا محسوس کریں گے کہ گویا اندھیرے میں دفعتاً روشنی نمودار ہو گئی۔

باب دوم

زندگی کا نصب العین

صحیح اجتماعی نصب العین کے لازمی خصائص۔

انسان کا فطری نصب العین۔

دو مقبول اجتماعی نصب العین اور ان پر تنقید۔

اسلامی تہذیب کا نصب العین اور اس کی خصوصیات۔

۱۔ طبعی اور عقلی نصب العین کی ہم آہنگی۔

۲۔ نظام اسلامی کی قوت جاذبہ

۳۔ فکر و عمل کی یکسوئی۔

۴۔ خالص بشری اجتماعیت کی شیرازہ بندی۔

۵۔ تمام انسانی مرادات کا بالیق حصول۔

۶۔ تقویٰ اور نیکوکاری کے لئے بہترین محرک۔

۷۔ طریقوں کے امتیاز میں مقصد کی تعین کا اثر۔

۸۔ اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اس کے نصب العین کا حصہ

زندگی کا نصب العین

تصورِ حیات کے بعد دوسرا سوال جو ایک تہذیب کے حسن و قبح کو جانچنے میں خاص اہمیت رکھتا ہے، یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے کون سا نصب العین پیش کرتی ہے؟ اس سوال کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ انسان کے ارادوں اور اس کی عملی کوششوں کا رخ فطری طور پر اسی منتہا اور اسی مقصود کی طرف پھرتا ہے۔ جس کو اس نے اپنا نصب العین اور مطلع نظر قرار دیا ہو۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے پر ذہنیت کی اچھی یا بُری تشکیل اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں کے درست یا نادرستی کا انحصار ہے۔ اسی کے بلند یا پست ہونے پر افکار و تخیلات کی بلندی و پستی، اخلاق و ادب کی فضیلت و رذیلت اور معیشت و معاشرت کی رفعت و ذلت کا مدار ہے۔ اسی کے واضح اور متعین ہونے یا نہ ہونے پر انسان کے ارادوں اور خیالات کا مجتمع یا پراگندہ ہونا، اس کی زندگی کے معاملات کا ہموار یا ناہموار ہونا، اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا ایک راہ میں صرف ہونا یا مختلف راہوں میں منتشر ہو جانا موقوف ہے۔ بالجملة نصب العین ہی وہ چیز ہے جس کی بدولت انسان فکر و عمل کی بہت سی راہوں میں سے کوئی راہ انتخاب کرتا اور اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں اور اپنے مادی و روحانی وسائل کو اسی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ لہذا جب ہم کسی تہذیب کو نقدِ صحیح

کے معیار پر جانچنا چاہیں تو ہمارے لئے اس کے نصب العین کے جستجو ناگزیر ہے۔

صحیح اجتماعی نصب العین کے لازمی خصائص

لیکن بحث و تحقیق کی راہ میں قدم اٹھانے سے پہلے ہم کو یہ متعین کر لینا چاہیئے کہ تہذیب کے نصب العین سے ہماری مراد کیا ہے؟ یہ ظاہر ہے کہ جب ہم ”تہذیب“ کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد افراد کی شخصی تہذیب نہیں ہوتی بلکہ ان کی اجتماعی تہذیب مراد ہوتی ہے۔ اس لئے ہر فرد کا شخصی نصب العین، تہذیب کا نصب العین نہیں ہو سکتا۔ لیکن برعکس اس کے یہ لازم ہے کہ ایک تہذیب کا جو نصب العین ہو وہ اس تہذیب کے متبعین میں سے ہر ہر فرد کا نصب العین ہو، عام اس سے کہ ہر فرد کو اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔ اس لحاظ سے تہذیب کا نصب العین وہ ہے جو شعوری یا غیر شعوری طور پر انسانوں کی ایک بڑی جماعت کا مشترک اجتماعی نصب العین بن گیا ہو اور اس نے افراد کے شخصی نصب العین پر اتنا غلبہ پایا ہو کہ ہر فرد بجائے خود وہی نصب العین رکھتا ہو جو پوری جماعت کے پیش نظر ہے۔

اس قسم کے اجتماعی نصب العین کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے کہ وہ افراد کے شخصی نصب العین سے کامل موافقت و مناسبت رکھتا ہو اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ معاںفرادی اور اجتماعی نصب العین بن سکے۔ اس لئے کہ اگر اجتماعی نصب العین افراد کے شخصی نصب العینوں سے منافات کی نسبت رکھتا ہو تو اولاً اس کا اجتماعی نصب العین بننا ہی مشکل ہوگا، کیونکہ جس خیال کو افراد فرداً فرداً قبول نہ کریں وہ اجتماعی خیال نہیں بن سکتا، اور اگر کسی زبردست اثر کے تحت وہ اجتماعی نصب

العين بن بھی گیا ہو تو فرد کے نصب العين اور جماعت کے نصب العين میں غیر محسوس طور پر ایک کشمکش برپا رہے گی، تا آنکہ اس غالب اثر کے کمزور ہوتے ہی افراد اپنے اپنے نصب العين کی طرف پھر جائیں گے، جماعت کا نصب العين باطل ہو جائے گا، ہیئت اجتماعی کی قوت جاذبہ و رابطہ فنا ہو جائے گی اور تہذیب کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔ اس لئے تہذیب کا صحیح نصب العين وہی ہو سکتا ہے۔ جو حقیقتہً انسان کا فطری نصب العين ہو، اور ایک تہذیب کی اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ ایسا اجتماعی نصب العين پیش کرے جو بعینہً انفرادی نصب العين بھی بن سکتا ہو۔

اس نقطہ نظر سے ہمارے سامنے دو سوال آتے ہیں۔ جن کو حل کیئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ایک یہ کہ فطرۃً انسان کا شخصی نصب العين کیا ہے؟

دوسرے یہ کہ دنیا کی دوسری تہذیبوں نے جو نصب العين پیش کیئے ہیں، وہ کس حد تک انسان کے اس فطری نصب العين سے مناسبت رکھتے ہیں؟

انسان کا فطری نصب العين

انسان کے فطری نصب العين کا سوال دراصل یہ سوال ہے کہ انسان فطری طور پر دنیا میں کس مقصد کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اور اس کی طبیعت کس چیز کی خواہش مند ہوتی ہے؟ اس کی تحقیق کے لئے اگر آپ فرداً فرداً ہر شخص سے پوچھیں کہ وہ دنیا میں کیا چاہتا ہے تو آپ کو مختلف لوگوں سے مختلف جوابات ملیں گے اور شاید کوئی دو آدمی بھی ایسے نہ ملیں جن کے مقاصد اور جن کی خواہشات بالکل یکساں ہوں۔ لیکن ان سب کا استقصاء کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ

لوگوں نے جن چیزوں کو مقاصد قرار دیا ہے وہ دراصل فی نفسہ مقصود نہیں ہیں بلکہ ایک مقصود تک پہنچنے کے ذرائع ہیں، اور وہ واحد مقصود خوشحالی و اطمینانِ قلب ہے۔ ہر شخص خواہ وہ کسی مرتبہ عقلی و ذہنی اور کسی طبقہ عمرانی سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ کسی شعبہ حیات اور کسی میدانِ عمل میں جدوجہد کر رہا ہو، اپنی کوششوں کے لئے ایک ہی نصب العین رکھتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اسے امن، سلامتی، خوشی اور جمعیتِ خاطر نصیب ہو۔ لہذا اس کو ہم فردِ انسانی کا فطری نصب العین کہہ سکتے ہیں۔

دو مقبول اجتماعی نصب العین اور ان پر تنقید

دنیا کی مختلف تہذیبوں نے جو اجتماعی نصب العین پیش کیے ہیں ان کو بھی اگر جزئیات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں بہت کچھ اختلافات پائے جائیں گے، جن کا حصر کرنا نہ یہاں مقصود ہے اور نہ ممکن۔ لیکن اصولی حیثیت سے ہم ان سب کو دو قسموں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ جن تہذیبوں کی بنیاد کسی مذہبی و روحانی تخیل پر نہیں ہے انہوں نے اپنے متبعین کے سامنے تفوق و برتری کا نصب العین پیش کیا ہے یہ نصب العین متعدد اجزاء سے مرکب ہے جن میں سے خاص اور اہم اجزاء ترقی کی یہ ہیں۔

و سیاسی غلبہ و استیلاء کی طلب۔

و دولت و ثروت میں سب سے بڑھ جانے کی خواہش، عام اس سے کہ وہ فتح ممالک کے ذریعے سے ہو یا تجارت و صنعت پر حاوی ہو جانے کی بدولت۔

و عمرانی ترقی کے مظاہر میں سب پر سبقت لے جانے کی خواہش،

نواہ وہ علوم و فنون کے اعتبار سے ہو، یا آثارِ مدنیّت و تہذیب میں شان و شکوہ کے اعتبار سے۔

یہ اجتماعی نصب العین ظاہر نظر میں اس شخصی نصب العین کے منافی نہیں ہے جس کا اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں۔ کیونکہ ادنیٰ غور و تأمل کے بغیر یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ اگر جماعت کا یہ نصب العین متحقق ہو جائے تو فرد کا نصب العین مع شئی زائد متحقق ہو جائے گا۔ اس نصب العین کی یہی ظاہر فریبی ہے جس کی بدولت ایک قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد اپنے شخصی نصب العین کو اس میں گم کر دیتے ہیں۔ لیکن تعمیق نظر اور پھر عملی تجربہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ اجتماعی نصب العین فرد کے فطری نصب العین سے سخت منافات رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں تفوق و برتری کا یہ نصب العین رکھنے والی صرف ایک ہی قوم نہیں ہوتی، بلکہ ایک زمانہ میں متعدد قومیں اپنے سامنے یہی نصب العین رکھتی ہیں، اور وہ سب اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں شدید سیاسی و معاشی اور تمدنی کشمکش برپا ہوتی ہے، مسابقت و مقابلہ اور مزاحمت کے زبردست ہنگامے رونما ہوتے ہیں، اور شورش و اضطراب کے عالم میں افراد کو امن و سکون اور خوشحالی و اطمینان قلب کا میسر آنا قریب قریب محال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہی حالت ہمساری آنکھوں کے سامنے مغربی ممالک میں درپیش ہے۔ تاہم اگر ایک زمانہ ایسا بھی فرض کر لیا جائے جس میں صرف ایک ہی قوم اس نصب العین کے لئے کوشش کرنے والی ہو، اور کوئی دوسری قوم اس نصب العین کی خاطر اس کی مزاحمت کرنے والی نہ ہو، تب بھی اس کی کامیابی افراد کے شخصی نصب العین کا متحقق ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ

ایسے اجتماعی نصب العین کا یہ فطری خاصہ ہے کہ وہ بین الاقوامی مقابلہ ہی نہیں پیدا کرتا بلکہ خود ایک قوم کے اپنے افراد میں بھی باہم مسابقت کی ذہنیت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی بدولت قوم کے ہر فرد کا مقصد حیات یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دوسرے اپنائے قوم پر غلبہ حاصل کرے، دولت، حکومت، طاقت، شان و شوکت اور اسباب عیش و نعمت میں سب سے بڑھ جائے، دوسروں کے رزق کی گنجیاں اس کے ہاتھ آجائیں، جتنے وسائل ثروت ممکن ہوں ان کا اُچارہ اس کی ذاتِ واحد کو حاصل ہو جائے، فوائد و منافع اس کا حصہ ہوں اور خسران و نامرادی دوسروں کا حصہ، صاحبِ امر وہ ہو اور دوسرے اس کے مطیع و دستِ نگر بن کر رہیں۔ اول تو اس قسم کے لوگوں کی حرص و طمع کسی مرتبہ پر بھی پہنچ کر قانع نہیں ہوتی اس لئے وہ ہمیشہ غیر مطمئن اور بے چین رہتے ہیں۔ دوسرے اس نوع کا مقابلہ جب ایک قوم کے خود اپنے افراد میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس میں ہر گھر اور ہر بازار ایک میدانِ جنگ بن جاتا ہے اور امن و اطمینان، سکون و سلامتی اور مسرت و خوشحالی ناپید ہو جاتی ہے، خواہ دولت و حکومت اور اسبابِ نعمت کی کتنی ہی کثرت ہو۔

علاوہ بریں یہ ایک فطری بات ہے کہ خالص مادی ترقی، جس میں روحانیت کا کوئی حصہ نہ ہو، انسان کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتی کیونکہ محض حسی لذات کا حصول ایک خالص حیوانی نصب العین ہے اور اگر یہ ہے کہ انسان حیوانِ مطلق سے زائد کوئی چیز ہے، تو یقیناً یہ بھی صحیح ہے چاہیئے کہ انسان کو محض ان چیزوں کا حصول مطمئن نہیں کر سکتا کی لذتیں صرف اس کی حیوانی خواہشات کی تسکین کے لئے کافی ہیں۔

۲۔ جن تہذیبوں کی بنیاد مذہبی و روحانی تخیل پر رکھی گئی ہے انہوں نے عموماً اپنا نصب العین نجات کو قرار دیا ہے۔ بلاشبہ اس نصب العین میں وہ روحانی عنصر موجود ہے جو انسان کو سکون اور اطمینان قلب بخشتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ نجات جس طرح ایک قوم کا نصب العین بن سکتی ہے اسی طرح فرداً فرداً ہر شخص کا نصب العین بھی بن سکتی ہے، لیکن زیادہ گہری تنقید سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ نصب العین ایک صحیح نصب العین ہی نہیں بن سکتا۔ اس کے چند وجوہ ہیں:-

اولاً، نجات کے نصب العین میں ایک طرح کی خود غرضی چھپی ہوئی ہے جس کا خاصہ یہ ہے کہ اجتماعیت کو کمزور کر کے انفرادیت کو قوت پہنچائے۔ کیونکہ جب ہر شخص بجائے خود چند خاص اعمال انجام دے کر نجات حاصل کر سکتا ہو تو اس نصب العین میں کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جو اس کو انفرادی کے بجائے اجتماعی حیثیت دینے والی اور اس کے تحقق کے لئے فرد کو جماعت کے ساتھ اشتراک عمل پر ابھارنے والی ہو۔ یہ انفرادیت کی روح اس مقصد کے بالکل خلاف ہے جو تہذیب کا من حیث التہذیب عین مقصد ہے۔

ثانیاً، نجات کا مسئلہ دراصل طریقہ حصول نجات کے مسئلہ سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اور اس نصب العین کے صحیح یا غلط ہونے میں اس طریقہ کے صحیح یا غلط ہونے کو بھی بہت کچھ دخل حاصل ہے جو اس تک پہنچنے کے لئے تجویز کیا گیا ہو۔ مثلاً جن مذاہب نے ترک دنیا اور رہبانیت کو ذریعہ نجات قرار دیا ہے، ان میں نجات نہ انفرادی نصب العین بن سکتی ہے اور نہ اجتماعی۔ ایسے مذاہب کے متبعین آخر کار دنیا کو دنیا سے الگ کرنے اور دنیا داروں کی نجات کے لئے بیچ کر راستے

(مثلاً دین داروں کی خدمت یا کفارہ وغیرہ) نکال لینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تو یہ نصب العین یکسانی و یکجائی کے ساتھ فرد اور جماعت کا مشترک نصب العین نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ دین داروں کی ایک قلیل تعداد کے سوا باقی پوری جماعت کے لئے اس نصب العین میں وہ رفعت، وہ اہمیت، وہ جاذبیت اور وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو اسے اپنا گرویدہ بنائے رکھتی۔ اس لئے تمام دنیا دار اس کو چھوڑ کر اُس مادی نصب العین کے پیچھے پڑ گئے۔ جس کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ دوسری طرف جن مذاہب نے نجات کو مختلف دیوتاؤں اور معبودوں کی خوشنودی پر موقوف قرار دیا ہے اُن میں نصب العین کا اشتراک برقرار نہیں رہتا۔ مختلف گروہ مختلف معبودوں کی طرف پھر جاتے ہیں اور نصب العین کی وہ حقیقی وحدت ہی باقی نہیں رہتی جس کو قائم کرنا اور جس کے رشتہ میں اپنے تمام متبعین کو مربوط کر دینا ایک تہذیب کا اصلی کام ہے۔ اس لئے ان مذاہبوں کے پیرو بھی جب بُر دنیوی ترقی کے راستے پر جاتا اور اپنی جماعت کی شیرازہ بندی کرنا چاہتے ہیں تو ان کو کسی دوسرے نصب العین کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک اور قسم مذاہب کی وہ ہے جس کی دعوت کا خطاب انسان بحیثیت انسان سے نہیں ہے، بلکہ کسی خاص نسل اور خاص جغرافیائی حدود میں رہنے والی قوم سے ہے۔ اور اس بنا پر اس کے نزدیک نجات بھی اُس خاص نسل و قوم کے لئے مخصوص ہے۔ یہ نصب العین بلاشبہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مرحلہ میں ایک کامیاب اجتماعی نصب العین بن سکتا ہے، مگر چونکہ یہ عقلِ صحیح کے معیار پر پورا نہیں اُترتا، اور نجات کا کسی مخصوص نسل کے لئے مختص ہونا ایسی بات ہے جس کو ماننے سے ہر سلیم الفطرت انسان کی عقل انکار کرتی ہے، اس لئے ایسے مذاہب کے

متبعین عقلی ترقی کی راہ میں چند ہی قدم آگے بڑھ کر اس نصب العین کے خلاف خود بغاوت کر دیتے ہیں اور اس کو اپنے ذہن سے خارج کر کے کوئی دوسرا نصب العین اختیار کر لیتے ہیں۔

ثالثاً، نجات کا نصب العین دینی و روحانی نقطہ نظر سے خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو، لیکن دنیوی نقطہ نظر سے اپنے اندر کوئی چیز ایسی نہیں رکھتا جو ایک قوم کو من حیث القوم اُبھارنے والی اور اس کے اندر وہ حرارت، وہ قوت اور وہ حرکت پیدا کرنے والی ہو جو قومی ترقی کے لئے لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ترقی پسند قوم نے اس کو اپنا اجتماعی نصب العین نہیں بنایا، اور اُن قوموں میں بھی اس کی حیثیت ہمیشہ ایک انفرادی نصب العین ہی کی رہی ہے جن کے مذہب نے صرف یہی ایک نصب العین پیش کیا ہے۔

یہ وجہ ہیں جن کی بنا پر مادی اور روحانی دونوں نصب العین نقدِ صحیح کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلامی تہذیب نے کس چیز کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے اور اس میں کیا خصائص ہیں جو اس کو ایک صحیح نصب العین بناتے ہیں۔

اسلامی تہذیب کا نصب العین اور اس کی خصوصیات اس بحث کے آغاز ہی میں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ نصب العین کا سوال درحقیقت تصورِ حیات کے سوال سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں، اور دنیا میں اپنی حیثیت اور اپنے لئے دنیا کی حیثیت کا جو نظریہ ہمارے ذہن میں ہے، وہی فطری طور پر زندگی کا ایک نصب العین پیدا کر دیتا ہے، اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کے تحقق کی راہ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اگر دنیا کو ہم اپنے لئے ایک چراگاہ تصور کرتے ہیں

اور ہمارے ذہن میں زندگی عبارت ہے ایک مہلت سے جو ہم کو کھانے پینے اور لذاتِ دنیا سے متمتع ہونے کے لئے ملی ہوئی ہے، تو بلاشبہ یہ حیوانی تصور ہمارے نفس میں زندگی کا ایک حیوانی نصب العین راسخ کر دے گا اور ہم تمام عمر اپنے لئے حسی لذتوں کے سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے اپنے آپ کو پیدائشی مجرم اور فطری گنہگار سمجھا ہے، اور دنیا کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ کوئی عقوبت خانہ اور عذاب کا گھر ہے جہاں اپنے اس پیدائشی جرم کی سزا بھگتنے کے لئے ہم پھینک دیئے گئے ہیں، تو قدرتی طور پر یہ تصور ہمارے نفس میں اس عذاب سے رہائی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرے گا، اور اس بنیاد پر ہم نجات کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں گے۔ لیکن اگر دنیا کے متعلق ہمارا تصور چراگاہ اور دارالْعذاب دونوں سے برتر ہو، اور انسان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو حیوان اور مجرم دونوں سے زیادہ ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہوں، تو یقیناً ہمارے نفس کو مادی لذات کی طلب اور نجات کے حصول دونوں سے زیادہ بلند نصب العین کی تلاش ہوگی، اور کسی پست اور ادنیٰ مصلح نظر پر ہماری نگاہ نہ ٹھہرے گی۔

اس قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر جب آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور رُوسے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے، تو اس تصورِ حیات سے جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے اس تک آپ کی عقل خود بخود پہنچ جائے گی ایک نائب کا بحیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہیئے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے اور اس کی نظریں ایک اچھا، وفادار، متدین اور فرض شناس ملازم قرار

پائے؟ اگر وہ کوئی سچا اور نیک نیت آدمی ہے تو کیا وہ اپنے آقا کے خدمت بجالانے میں اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور چیز کو اپنا مقصود بنا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنا فرض اس لئے بجالائے گا کہ اس کے معاوضہ میں اس کو کسی نفع کی طرح اور کسی ترقی یا انعام یا اضافہ مناصب یا جہاد و منزلت کی زیادتی کا لالچ ہے؟ یہ دوسری بات ہے کہ آقا اس سے خوش ہو کر اسے یہ سب کچھ عطا کر دے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آقا اس کو حسن خدمت کے صلہ میں ان چیزوں کے بخش دینے کی امید دلائے، اور اس میں بھی مضائقہ نہیں کہ خود اس کو یہ علم ہو کہ اگر میں نے ٹھیک طور سے فرائض انجام دے کر اپنے آقا کو خوش کر دیا تو وہ مجھے یہ انعام دے گا۔ لیکن اگر اس نے انعام کو اپنا مقصود بنا لیا، اور اپنے فرائض منفعت کی خاطر انجام دیئے، تو کیا کوئی دانشمند ایسے ملازم کو ایک فرض شناس ملازم کہہ سکتا ہے؟ اسی مثال پر خدا اور اس کے نائب کے معاملہ کو بھی قیاس کر لیجئے۔ اگر انسان روئے زمین پر خدا کا نائب ہے تو اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ نصب العین ہے جو اس تصور حیات سے خود عقل اور فطرت پیدا کرتی ہے اور کسی ادنیٰ فرق کے بغیر ٹھیک یہی نصب العین ہے جو اسلام نے انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات کا تتبع کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ طرح طرح سے اسی ایک نصب العین کو ذہن نشین کرنے اور قلب و روح میں بٹھا دینے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے سوا ہر دوسرے مصلح نظر کا پورے زور کے ساتھ ابطال کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ :-

قُلْ إِنَّا صَلَوَتِي وَنُشْكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ

مَا يَتَّخِذُ الْعَالَمِينَ لِأَشْرِيكَ لَمَّا وَبَّذَ إِلَيْكَ أَمْرُكَ
وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ۔ (الانعام۔ ۲۰)

”اے پیغمبرؐ کہہ دیجئے کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جہنم
اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور
جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں
سب سے پہلے اُس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔“

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ
وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ..... فَاسْتَبَشِرُوا بِبَيْعِكُمُ
الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۖ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ۔

(التوبة۔ ۱۲)

”اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید
لیئے ہیں جن کے معاوضہ میں اُن کے لئے جنت ہے۔ وہ اللہ کے
راہ میں جنگ کرتے ہیں، مارے جاتے ہیں اور مارے جاتے ہیں.....
پس اس سودے پر جو تم نے (اپنے خدا سے) کیا ہے خوشی مناؤ
حقیقت میں یہی بڑی کامیابی ہے۔“

سُورَةُ بَقَرَةٍ میں نافرمان اور فرمانبردار بندے کا فرق بتاتے ہیں
فرمانبردار بندے کی تعریف یہ کی ہے کہ

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ
مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (البقرہ۔ ۲۵)

”اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اپنی جان کو اللہ کے
خوشنودی کی خاطر بیچ دیتا ہے، اور اللہ اپنے بندوں پر شفقت
کرنے والا ہے۔“

سُورَةُ فَتْحِ مِیْنِ مُسْلِمَانُوں كِی تَحْرِیْفِ هِی یِه كِی گئی هے كِه یِه وَه لُوكِ
هِيں جَن كِی دُوسْتِی اور دُشْمَنِی اور جَن كَار كُوعِ وَ سُجُودِ سَب كُچھ اَللّٰه كِے
لِیْے هے :-

مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ
عَلَى الْكُفَّاءِ رَاحِمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا
يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا - (رُكُوع - ۲)

”مُحَمَّدُ اللّٰه كِے رَسُوْلِ هُوئے هِيں - اور هُو لُوكِ اَن كِے
سَاْتَه هِيں وَه كَافِرُوں پَر سَخْتِ اور اُپْسِ مِیْنِ رَحْمِ دِلِ هِيں - تَمِ هِمِیْشَه اَن
كُو رُكُوعِ وَ سُجُودِ كَرْتِے هُوئے دِیْكْهْتِے هُو - یِه لُوكِ اَللّٰه كِے فَضْلِ اور اَس
كِی خُوشنُودِی كِے طَلَبِ كَارِ هِيں :-

سُورَةُ مُحَمَّدٍ مِیْنِ كَافِرُوں كِے اَعْمَالِ ضَالِحِ هُونِے كِی وَجِهَ یِه بَتَانِی گئی
هے كِه وَه خُدا كِے لِیْے كُچھ نِهِيں كَرْتِے بَلَكِه دُوسَرِی اَعْرَاضِ كِے لِیْے
عَمَلِ كَر كِے خُدا كِی نَاخُوشِی مَولِ لِیْتِے هِيں -

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا اَسْخَطَ اللّٰهُ وَكَرِهُوا
رِضْوَانَهُ فَاَخْبَطَ اَعْمَالَهُمْ - (رُكُوع - ۳)

”اَن پَر مَار اَس لِیْے پُڑے گی كِه اَنهُوْنِے اَس چِزِ كِی پِروِی
كِی جِس نے خُدا كُو نَاخُوشِی كَر دِیَا اور اَنهُوْنِے خُدا كِی خُوشنُودِی
حَاصِلِ كَرْنِے كُو پَسَنْدِ نَه كِیَا - اَس لِیْے اَللّٰه نے اَن كِے اَعْمَالِ اَكَاْرَتِ
كَر دِیْئے :-

سُورَةُ حَجِّ مِیْنِ خُدا كِی اِیْسِی عِبَادَتِ كُو جُودِ نِوِی فَوَائِدِ كِی خَاْطِرِ هُو قَطْعًا
بِے كَارِ، اور مُوْجِبِ نَا مَرَادِی قَرَارِ دِیَا گِیَا هے -

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلَى حَرْفٍ
فَاِنْ اَصَابَهُ خَيْرٌ اَطْمَآنَ بِهَا وَاِنْ اَصَابَتْهُ

فَتَنَّمَا نَقَلَبَ عَلَى وَجْهِهَا خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ
ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔ (رکوع ۲)

”اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کی عبادت اکثرے
دل سے کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو اس سے مطمئن ہو
گیا اور اگر کوئی آزمائش کا وقت آگیا تو اٹا پھر گیا۔ ایسا شخص دنیا
اور آخرت دونوں میں نامراد ہوا۔ اور یہی صریح لکھا ہے۔“

سُورَةُ بَقَرَةٍ میں بتایا گیا ہے کہ جو خیرات لوگوں کو دکھانے کے لئے کی
جائے اور جس مال کو دے کر آدمی احسان جتائے وہ باطل ہے۔ اس کی
مثال ایسی ہے کہ ایک چٹان پر تھوڑی سی مٹی پڑی تھی، تم نے اس میں
بیج بویا، مگر پانی کا سیلاب آیا اور اس کو بہا لے گیا۔ بخلاف اس کے
جو خیرات ثباتِ نفس کے ساتھ خاصِ خدا کی خوشنودی کے لئے کیجائے
اس کی مثال ایسے باغ کی سی ہے جس پر اگر خوب بارش ہو تو دو چند
پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ ہو تب بھی ہلکی سی پھو ہار ہی اس کے
پھلنے پھولنے کے لئے کافی ہو جائے۔ (رکوع ۳۶)

اس بات کو مختلف مقامات پر مختلف پیرایوں میں سمجھایا گیا ہے
کہ تم جو نیک عمل بھی کرو صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کرو اور اس سے
کوئی اور غرض نہ رکھو۔

وَمَا تَنْفَقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَفْسِكُمْ وَمَا تَنْفَقُونَ
إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ۔ (البقرہ ۳۷)

”تم جو کچھ بھی خیرات کی مد میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہارے
ہی لئے ہے، اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو صرف خدا ہی کی رضا
جوئی کے لئے کرتے ہو۔“

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا

الصَّلَاةَ وَانْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
وَيَذَرُونَ بِالْحَسَنَةِ الشَّيْئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى
الدَّارِ الْآخِرَةِ (الرعد-۳)

”اور جن لوگوں نے اپنے رب کی رضا جوئی کے لئے صبر کیا
اور نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی عطا کی تھی اس میں سے
پوشیدہ یا ظاہر خرچ کیا اور جو لوگ نیکی سے بدی کو دفع کرتے ہیں
آخرت کا گھر ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے۔“

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ
وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا أَتِنَاءً
وَجِدَ سَرَبِدًا لِّأَعْلَىٰ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ (اللیل)

”اور عذابِ نار سے وہ بڑا پرہیزگار پنح جائے گا جو پاکیزگی نفس
کے ساتھ اپنا مال دیتا ہے۔ اُس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس
کا بدلہ اسے دینا ہو بلکہ وہ صرف اپنے بالا و برتر پروردگار کی خوشنودی
چاہتا ہے اور ضرور وہ راضی ہو جائے گا۔“

فَإِنَّ ذَٰلَ الْقُرْبَىٰ حَقٌّ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ
ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الروم-۴)

”پس تو اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر
کو (اس کا حق)۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو خوشنودی الہی
چاہتے ہوں اور حقیقت میں وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“
وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْغِفُونَ (الروم-۴)

”جو زکوٰۃ تم نے دی اور اس سے تم صرف اللہ کی خوشنودی

حاصل کرنا چاہتے ہو تو جو لوگ ایسا کر رہے ہیں وہی اپنے دیئے کو دوگنا
ہوگنا کر رہے ہیں۔“

وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهَا مَسْكِينًا وَيَتِيمًا
وَأَسِيرًا۔ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ
جَزَاءً وَلَا شُكُورًا۔ إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا
قَطَرِيرًا۔ فَوْقَهُمْ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ
نَضْرَةً وَسُرُورًا۔ (الدھر-۱)

”اور اللہ کی محبت کی خاطر مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو خدا کے لئے کھلا رہے ہیں۔ ہم تم سے نہ کوئی
بڑا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ ہم کو تو اپنے رب سے اُس دن کا خوف لگا
ہوا ہے جب لوگوں کے منہ بنے ہوئے ہوں گے اور ان کے چہروں
پر شکنیں پڑ جائیں گی۔ پس اللہ نے ان کو اس دن کے شر سے بچالیا اور
کو تازہ روئی اور خوش حالی سے ہم آغوش کر دیا۔“

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ
وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا
وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔
(الحشر-۱)

”فے میں اُن غریب لوگوں کا حصہ بھی ہے۔ جنہوں نے ہجرت کی
ہے اور جو اپنے گھروں اور جائیدادوں سے نکالے گئے ہیں (اور جنہوں
نے یہ سب کچھ اس لئے قبول کیا ہے کہ) وہ اللہ کا فضل اور اس کی
خوشنودی چاہتے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کے کام آتے ہیں،
حقیقت میں یہی لوگ سچے ہیں۔“

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا

كَانَتْهُمْ بُنْيَانٌ مَّزْمُوعٌ۔ (الصف-۱)

”اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح
صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار
ہیں۔“

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
الَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ۔
(النساء-۱۰)

”جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں

اور جو کافر ہیں وہ ظلم و سرکشی کی خاطر لڑتے ہیں۔“

اس تمام تعلیم کو صاحبِ جوامع الکلم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
نے ایک جملہ میں ادا فرمایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا قاعدہ کلیہ
بیان فرما دیا ہے جو تمام معاملات اور عبادات پر پوری طرح حاوی
ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ
لَهُ خَالِصًا وَابْتِغَىٰ بِهِ وَجْهًا۔

”اللہ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالص اس کے لئے

کیا جائے اور جس سے محض اس کی رضا جوئی مقصود ہو۔“

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام نے ہر قسم کی دنیوی
اور اخروی اغراض کو چھوڑ کر ایک چیز کو زندگی کا نصب العین، اور انسان
کی تمام کوششوں کا مقصود، اور تمام ارادوں اور نیتوں کی غایت
الغایات قرار دیا ہے، اور وہ چیز اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی
کا حصول ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس نصب العین میں وہ کون
سی خصوصیات ہیں جو اس کو ایک بہترین نصب العین بناتی ہیں۔

۱۔ طبعی اور عقلی نصب العین کی ہم آہنگی

کائنات کے متعلق اسلام کا نظریہ، جو نظریہ کی حد سے گزر کر ایمان اور یقین کی آخری حد تک پہنچ گیا ہے، یہ ہے کہ وجود کی اس غیر محدود سلطنت کا فرمانروا ایک خدا ہے، اور تمام موجوداتِ عالم اسی کے مطیع، اسی کے تابع فرمان اور اسی کے آگے سر بسجود ہیں۔ وَلَئِنْ مَنَّا فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ كُلِّ لَدُنَّا قَائِمُونَ۔ (الروم - ۳) کارگاہِ مستی کی تمام حرکات و سکنات اسی کے حکم اور اسی کی مرضی کے ماتحت ہیں۔ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ۔ (الانعام - ۷) جتنی چیزیں اس عالم اور دوسرے تمام عالموں میں ہیں ان سب کا مرجع اسی کی ذات ہے۔ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ۔ (البقرہ - ۲۵) اسی چیز کا نام اسلام ہے۔ جس کے معنی ہیں گردن جھکا دینے اور تابع فرمان ہو جانے کے۔ تمام کائنات اور اس کا ہر ذرہ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسی دینِ اسلام کا پیرو ہے، خواہ بطورِ رغبت، خواہ بقہر و جبر۔ وَلَئِنْ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا۔ (آل عمران - ۸۳) اس عالمگیر، ناقابلِ تغیر اور ناآشنائے استثنا قانون میں تمام کائنات کی طرح خود انسان بھی جکڑا ہوا ہے اور اس کی طبیعت و فطرت بھی اسی خدا کی مطیع و فرمانبردار اور اسی کے دین کی پیرو ہے۔ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا۔ قِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔ (الروم - ۴)

اس نظریہ کے مطابق تمام موجوداتِ عالم کا، جن میں انسان بھی شامل ہے، فطری نصب العین اور مقصود و مطلوب اور غایت الغایات حضرت حق جل ثناؤہ کی ذات ہے، اور سب کی طبیعت کا رخ اسی مرکز و مرجع کی طرف پھرا ہوا ہے۔ اب انسان کے لئے بحیثیت ایک عقلی

وجود کے صرف اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس طبعی نصب العین د
 شعور بھی حاصل کر لے اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو سمجھ کر اپنے ارادوں
 اور اپنی نیتوں اور اپنی سستی و عمل کا رخ بھی اسی کی طرف پھیر دے۔ اسے
 صورت میں اس کا عقلی نصب العین اُس کے اور تمام موجودات کے
 طبعی نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا۔ جہان ہستی کے
 سارے لشکر اور نظام وجود کے سب کل پرزے اس مقصود تک پہنچنے
 میں ان کا ساتھ دیں گے اور وہ اپنے عقلی مرتبہ کے لحاظ سے اس عظیم
 الشان قافلے کا سالار اور امام ہوگا۔ برعکس اس کے اگر اس نصب العین
 کو چھوڑ کر اس نے کسی اور چیز کو اپنا عقلی نصب العین بنایا تو اس کی مثال
 ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص ایک قافلے کے ساتھ ہے۔ قافلہ مغرب کے
 جانب سفر کر رہا ہے، وہ شخص خود جس گھوڑے پر سوار ہے وہ بھی مغرب
 کی جانب دوڑ کر رہا ہے، لیکن اس بے ہوش مسافر کو خبر نہیں کہ قافلہ کا
 رخ اور اس کی اپنی سواری کا رخ کدھر ہے۔ اس کا دل مشرق میں اٹکا
 ہوا ہے۔ اُس نے اپنے گھوڑے کی دم کی طرف اپنا منہ کر رکھا ہے۔
 رگام کھینچ کھینچ کر اور ایڑی لگا لگا کر کوشش کر رہا ہے کہ گھوڑا اُلٹے
 پاؤں چلے۔ چند قدم وہ گھوڑے کو پیچھے کی طرف کھینچ بھی لاتا ہے، مگر پھر
 قافلے کی روش اور خود اپنی طبعی روش سے مجبور ہو کر گھوڑا اسی مغربی سمت
 میں دوڑنے لگتا ہے۔ غرض اس طرح یہ مسافر کشاں کشاں اپنی نیت اور
 اپنے ارادے کے خلاف اسی منزل کی طرف جانے پر مجبور ہو جاتا ہے
 مگر ایک کامیاب اور بامراد مسافر کی طرح نہیں بلکہ ایک ناکام و نامراد
 مسافر کی طرح۔ کیونکہ اس نے جس چیز کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے
 اس تک پہنچنا اسے نصیب نہیں ہوتا اور جہاں فی الواقع وہ پہنچ جاتا
 ہے وہ جگہ نہ اس کی منزل مقصود ہوتی ہے اور نہ اس جگہ رہنے کے

لئے اس نے کوئی تیاری ہی کی ہوتی ہے۔
۲۔ نظام اسلامی کی قوت جاذبہ

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، دین اسلام کے پورے نظام کا مرکز اور مدار خدا کی ذات ہے۔ یہ پورا نظام اسی مرکز کے گرد گردش کر رہا ہے اس نظام میں جو کچھ بھی ہے، خواہ وہ نیت و اعتقاد کے قبیل سے ہو یا پرستش و عبادت کے قبیل سے یا دُنیوی زندگی کے معاملات میں سے، بہر نوع اور بہر کیفیت اس کا رخ اسی مرکزی ہستی کی جانب پھرا ہوا ہے اور ہر چیز اس کی قوت جاذبہ کے زبردست تاروں میں جکڑی ہوئی ہے خود لفظ دین (طاعت) اور لفظ اسلام (گردن بہاؤن) جن سے اس مذہبی نظام کو موسوم کیا گیا ہے، اپنے مسما کی فطرت و حقیقت پر بہترین دلالت کرتے ہیں۔ دین اور اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ بندہ اپنے خدا کی رضا کے آگے سر جھکا دے اور اسی کی مرضی کا تابع ہو جائے۔

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهًا لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔ (النساء۔ ۱۸)

”اس سے بہتر دین اور کس کا ہو گا جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور جو نیکو کار ہے؟“

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهًا إِلَى اللَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ۔ (لقمان۔ ۳)

”جو کوئی اپنا رخ خدا کی طرف پھیر دے اور اس کے ساتھ وہ نیکو

کار بھی ہو تو اس نے بڑی مضبوط رسی تھام لی۔“

اس سے بڑھ کر فطرت اسلام کا اندازہ اس چیز سے ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، بیٹا یا بھائی یا بھتیجہ یا تو مقرر کہہ کر اپنے آپ کو چھری کے

حوالے کر دیتا ہے، اور باپ اپنے لختِ جگر کو محض خدا کی خوشنودی کے لئے ذبح کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، تو ان دونوں کے اس فعل کو ”اسلام“ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّ لِلْجَبِينِ (الصفۃ-۳)

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو کچھ بھی ہے خدا کے لئے ہے۔ نماز اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ ایک بے معنی اٹھک بیٹھک ہے۔ روزہ اگر خدا کے لئے نہ ہو تو وہ محض ایک فاقہ ہے۔ زکوٰۃ و خیرات اگر خدا کے لئے ہو تو خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ ہے ورنہ محض اسراف و تبذیر۔ جنگ اور جہاد اگر خالصۃً للہ اور فی سبیل اللہ ہو تو بہترین عبادت ہے ورنہ محض ایک فساد اور ناحق کی خونریزی۔ اسی طرح دوسرے تمام افعال جن کا حکم اسلام میں دیا گیا ہے اگر خدا کے لئے کیے جائیں تو وہ نیک اور قابلِ اجر ہیں ورنہ بے فائدہ اور بے نتیجہ، اور جن سے اسلام نے منع کیا ہے اگر ان سے اجتناب خدا کی خوشنودی کی خاطر کیا جائے تو مفید ہے ورنہ قطعاً لا حاصل۔

یہ زبردست مرکزیت اور یکسوئی جو اسلام کے نظام میں نظر آتی ہے اسی نصب العین کی پیدا کردہ ہے۔ یہی قوتِ جاذبہ ہے جس نے نظامِ اسلامی کے تمام اجزاء میں ایک طاقت اور مائل المرکز میلان پیدا کر دیا ہے، جس کی بدولت یہ نظام ویسا ہی ایک مکمل اور مضبوط نظام بن گیا ہے جیسا موجودہ زمانے کے علمِ ہدایت کی رُو سے ہمارا نظام شمسی مکمل اور مضبوط ہے۔ اگر یہ نصب العین نہ ہوتا تو دینِ اسلام میں یہ نظم بھی نہ ہوتا۔

۳۔ فکر و عمل کی یکسوئی

جس طرح اس نصب العین نے اسلام کے نظامِ دینی میں مرکزیت

یکسوئی، اور ضبط و نظم کی قوت پیدا کی ہے، اُسی طرح یہ انسان کے افکار و خیالات، ارادت و نیات، اور عقائد و اعمال میں بھی کامل یکسوئی پیدا کر دیتا ہے۔ اور یکسوئی کے ساتھ یہ اس کو ایک ایسے بلند مطلع نظر اور ایک ایسے اعلیٰ و ارفع مقصد کی طرف ہمہ تن متوجہ کر دیتا ہے جس سے زیادہ بلند اور عالی شان اور رفیع المنزلت کوئی مقصد اور مطلع نظر نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کے پیش نظر محض اپنی طبعی خواہشات کی تسکین یا نفسانی اغراض کی تحصیل، یا روحانی مقاصد کی تکمیل ہو، اسے کبھی فکر و عمل کی یکسوئی میسر نہیں آ سکتی۔ کیونکہ عقل و ذہنی ارتقاء اور نظری و عملی اکتشاف کے ہر مرحلے میں اس کے اندر نئی خواہشیں اور نئی رغبتیں پیدا ہوں گی اور وہ نئی نئی چیزوں کو اپنی غایت اور اپنا مقصد قرار دیتا چلا جائے گا۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ علم اور عقل کے کسی اُونچے مرحلے پر پہنچ کر انسان انہی طبعی رغبتوں اور نفسانی روحانی مطالبوں پر جما رہے جو اس سے پہلے کے پست تر مرحلے میں اس کے لئے جاذب نظر اور محرک عمل تھے۔ اس طرح انسان کی تمام زندگی ایک مقصد سے دوسرے مقصد کی طرف انتقال میں بسر ہو جائے گی اور کبھی کوئی ایسا مرکزی تخیل اسکے ذہن میں جاگزیں نہ ہو سکے گا جو اس کے افکار میں کامل یکسوئی پیدا کر دینے والا ہو اور جس کی راہ میں وہ اپنی تمام فکری اور عملی قوتیں صرف کر سکتا ہو۔ یہ خوبی صرف اسلامی نصب العین ہی میں ہے کہ وہ ہر مرتبہ علمی و عقلی میں انسان کا واحد نصب العین بن سکتا ہے اور کسی اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبہ پر بھی پہنچ کر اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی۔ کیونکہ ہم جتنے عقلی اور عملی مراتب کا تصور کر سکتے ہیں۔ خدا کی ذات ان سب سے اعلیٰ و ارفع ہے، اور اس کے باوجود ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبہ سے لے کر بلند سے بلند مرتبہ تک ہر ایک کے ساتھ اس کا تعلق یکساں ہے

اگر فرق ہے تو وہ محض ہمارے تعقل و شعور کے مراتب کے لحاظ سے ہے۔

۴۔ خالص بشری اجتماعیت کی شیرازہ بندی

پھر جس طرح یہ نصب العین ایک فرد کا نصب العین بن سکتا ہے۔ اُسی طرح ایک جماعت، ایک قوم، بلکہ تمام نوع بشری کا نصب العین بھی بن سکتا ہے۔ اس میں سرے سے نفسانیت اور انفرادی یا اجتماعی خود غرضی کا وہ عنصر ہی موجود نہیں ہے جس کی طبعی خاصیت یہ ہے کہ انسانیت کو نسلوں اور قوموں میں اور پھر افراد و اشخاص میں تقسیم کر دے اور ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف مقابلہ و مزاحمت اور بغض و حسد کے جذبات ابھارتا ہے۔ برعکس اس کے یہ نصب العین انسان کو اُس ہستی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ جس کے ساتھ تمام نوع بشری، بلکہ تمام کائنات کا تعلق یکساں ہے اور جس کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد ہر جہت اور ہر حیثیت سے انسانی مقاصد میں ایسا اشتراک و اتحاد پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگوں میں مقابلہ و مزاحمت تو درکنار، تعاون اور موالات، اخوت اور بھائی چارہ کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ دُنیا کے جتنے مادی مقاصد ہیں۔ ان کی راہ میں دو آدمی بھی ایک دوسرے کے سچے مددگار نہیں ہو سکتے۔ بھائی اور بھائی، باپ اور بیٹے، ماں اور بیٹی کے لئے بھی ایک مادی مقصد میں مشترک ہو کر تزامم اور کشمکش، حتیٰ کہ عداوت اور دشمنی تک سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم نے خودِ رحم اور خون کے تعلقات منقطع ہوتے دیکھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بھائیوں نے بھائیوں کے گلے کاٹ دیئے ہیں۔ ہماری نگاہوں سے ایسے بے شمار مناظر گزرے ہیں اور گزرتے رہتے ہیں کہ قریب سے قریب عزیزوں نے دُنیوی

مقاصد کی خاطر ایک دوسرے کی جان، مال، عزت اور آبرو کو تباہ و برباد کر دیا۔ یہ سب اس نفسانیت اور خود غرضی کی تاثیرات ہیں۔ جو دنیوی اغراض و مقاصد کے عناصر ترکیبی میں سب سے اہم عنصر ہے۔ لیکن ذاتِ حق وہ غایت الغایات ہے جس کی جانب لاکھوں کروڑوں انسان بیک وقت دوڑ سکتے ہیں بغیر اس کے کہ ان میں کوئی کشمکش یا مقابلہ اور مزاحمت ہو، اور کسی ایک شخص کو بھی دوسرے شخص کی ٹھک نہ لگے۔ بلکہ یہ سفر تو ایسا سفر ہے جس کا ہر مسافر دوسرے مسافر کی عملی مدد کرتا ہے، اپنے آرام پر دوسرے کے آرام کو ترجیح دیتا ہے، اپنی مشقت کو دوسرے کی مشقت کے مقابلہ میں گوارا کر لیتا ہے۔ عیش و آرام کے ساتھ جانے سے بدرجہا بہتر اس کو سمجھتا ہے کہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا بوجھ ڈھو کر، دوسروں کی خدمت کر کے، ہانپتا، کانپتا، تنگ ماندہ، عرق عرق، منزلِ مقصود پر پہنچے اور اپنے مالک کی زیادہ سے زیادہ خوشنودی حاصل کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ نسل، رنگ، زبان اور جغرافیہ حدود کے امتیازات کو مٹا کر ایک عالمگیر قومیت کی تعمیر، اور ایک بین الاقوامی انسانی جمہوریت کی شیرازہ بندی کے لئے جس مرکزی تختل کی ضرورت ہے، وہ اس نصب العین میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس قسم کی جہانگیر تہذیب کے لئے اس سے بہتر نصب العین اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک طرف فردیت و انفرادیت کو بالکل فنا بھی نہیں کرتا، اور دوسری طرف انفرادیت کے تمام دافع المراكز میلانات کو مٹا کر اسے ایک خالص بشری اجتماعیت میں پوری طرح ضم بھی کر دیتا ہے۔

۵۔ تمام انسانی مرادات کا بالذات حصول

اس نصب العین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا میں انفرادیت

اور اجتماعی حیثیت سے انسان کے جتنے مقاصد ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے تحقق کے ساتھ بالنتیج حاصل ہو جاتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ انسان ان کو بالذات مقصود بنائے۔ قرآن مجید نے ایک ایک کر کے اُن سب چیزوں کو گنایا ہے جو رضائے الہی کے حصول کے ساتھ لازماً حاصل ہوتی ہیں۔

دنیوی زندگی میں انسان سب سے زیادہ جس چیز کا خواہشمند ہوتا ہے وہ امن و سکون، راحت اور اطمینان قلب ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کی طرف رجوع کرو اور اس کی خوشنودی کے طالب ہو جاؤ، یہ چیز تم کو آپ سے آپ مل جائے گی۔

بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهًا لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔
(البقرہ-۱۳)

”ہاں جس کسی نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکوکار ہو، تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے کوئی خوف نہیں ہے اور نہ وہ رنجیدہ ہوتے ہیں۔“

أَلَا يَذْكُرُ اللَّهُ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔ (الرعد-۴)

”آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب

ہوتا ہے۔“

دوسری چیز جو انسان دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے، خوشحالی ہے۔ یعنی ایسی زندگی جو پریشانی اور پرآگندہ خاطری سے خالی ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانے اور اس کے غضب سے بچنے اور اس کے خاطر پر ہیزگاری و نیکوکاری ————— اختیار کرنے سے یہ چیز بھی باحسن وجہ حاصل ہو جاتی ہے۔

وَلَوْ أَتَىٰ أَهْلَ الْقُرَىٰ ۖ مَنُوءُوا وَاتَّقُوا لَفَتَحْنَا
 عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ - (الاعراف-۱۲)
 ”اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگاری اختیار
 کرتے تو ہم ان پر آسمان و زمین سے برکتوں کے دروازے کھول
 دیتے۔“

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ
 مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّاهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ
 أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ - (النحل-۱۳)
 ”جس کسی نے نیک عمل کیا، اس حال میں کہ وہ مومن ہو تو خواہ
 وہ مرد ہو یا عورت، ہم اس کو ضرور خوشحالی کی زندگی بسر کرائیں گے اور
 یقیناً ایسے لوگوں کو ہم ان کے عمل سے بہت زیادہ اچھا بدلہ دیں
 گے۔“

تیسری چیز حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و سر بلندی ہے جو انسان
 بڑی مطلوب و مرغوب چیز ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تم خدا کے ہو جاؤ، یہ
 متاع خود تمہارے قدموں میں آ رہے گی۔

وَمَنْ يَتَوَلَّى اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْذِينَ آمَنُوا
 فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ - (المائدہ-۸)
 ”جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان لانے والوں کا
 دوست ہو گیا (وہ اللہ کی پارٹی میں شامل ہو گیا) اور اللہ کی پارٹی ہمیشہ
 غالب ہونے والی ہے۔“

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِّنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ
 الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ - (الانبیاء-۷)
 ”اور ہم زبور میں بعد از ذکر ان کے

کے وارث ہمارے صالح بند ہوں گے۔“

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ
قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا۔ (النور۔)

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان
سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلافت عطا کرے گا۔
جس طرح اس نے ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔
اور وہ ضرور ان کے اُس دین کو استحکام بخشنے گا۔ جس کو اس نے ان
کے لئے پسند کیا ہے، ان کی حالتِ خوف کے بعد ان کو امن عطا
کرے گا۔“

اسی طرح اخروی زندگی میں نجات انسان کی مطلوب ہے اور اس
کے متعلق بھی قرآن کہتا ہے کہ وہ صرف خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی
کے حاصل ہونے کا نتیجہ ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ امْرَأَتِي إِلَىٰ سِرَابِ
رَاضِيَةٍ مَّرْضِيَةٍ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي
جَنَّتِي۔ (الفرج)

”اے نفس مطمئن اپنے پروردگار کی طرف واپس ہو اس حال
میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے راضی۔ پھر (خدا کہے گا
کہ) تو میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں نے جتنی چیزوں کو مقصود اور غایت
قرار دیا ہے۔ اسلام نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی، بلکہ اُس چیز کو
اپنا مطمح نظر بنایا ہے۔ جس کے حصول سے یہ سب چیزیں خود بخود حاصل

ہو جاتی ہیں۔ دوسرے جن چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں ان کی نگاہ میں وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ ان کی طلب میں اپنے قلب کے ایک لمحہ کے لئے بھی لکھنے دے۔ اس کے پیش نظر تو ایک ایسا نصب العین ہے جو ان سب سے اور جہان ہستی کی ہر چیز سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب اس بلند ترین مقصود کو وہ پہنچ جائے گا اس کے تحت جتنی چیزیں ہیں وہ اس کو آپ سے آپ حاصل ہو جائیں گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح عمارت کی سب سے اونچی منزل پر پہنچ جانے والا بیچ کی تمام منازل کو اپنے قدموں کے نیچے پاتا ہے۔

۶۔ تقویٰ اور نیکو کاری کے لئے بہترین محرک

ایک اور خصوصیت اس نصب العین کی یہ ہے کہ اسلام پر ہیزگاری اور نیکو کاری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے، اور اس کے اوامر و نواہی کا جو ضابطہ پیش کیا ہے، اس کے اتباع پر انسان کو عمل کرنے کے لئے صرف یہی نصب العین ایک شریف اور پاکیزہ نصب العین ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ نیکی اس کی ہونی چاہیے کہ وہ نیکی ہے اور بدی سے اس لئے اجتناب ہونا چاہیے کہ وہ بدی ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ان کے اس قول کا مفہوم کیا ہے۔ نیکی محض نیکی کی خاطر کر کے کے معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کے فوائد و منافع سے قطع نظر کر کے نیکی خود نیکی ہے اور وہ انسان کی مقصود بن سکتی ہے۔ اور اسی طرح بدی محض اس کی بدی ہونے کی بنا پر اجتناب کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہر مضر توں اور نقصانات سے مجرد کر کے بدی اپنی ذات میں بدی ہے۔ اس کی ذات ہی کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے لئے قابل اجتناب

سکتی ہے۔ مگر حقیقتاً دنیا میں انسان کے لئے کسی ایسی خالص نیکی کا وجود ہی نہیں ہے جو ذاتِ فاعل کی طرف عائد ہونے والے تمام فوائد و منافع سے مجرد ہو۔ اور نہ کسی ایسی خالص بدی کا وجود ہے جو فاعل کی ذات کو پہنچنے والی جملہ مضرتوں سے خالی ہو۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں نیکی اور بدی کا تخیل ہی فائدے اور نقصان، منفعت اور مضرت کے تجربات سے پیدا ہوا ہے۔ انسان ہر اس فعل کو نیک کہتا ہے جس سے خود اس کی ذات کو کوئی حقیقی مضرت پہنچتی ہو خواہ وہ ظاہر نظر میں اپنے اندر کچھ منفعتیں بھی رکھتا ہو۔ اگر کسی فعل کو فائدے اور نقصان کے جملہ پہلوؤں سے مجرد کر لیا جائے اور وہ فعل محض ایک حرکت رہ جائے تو ہم اس پر نیک یا بد ہونے کا کوئی حکم نہیں لگا سکتے اس میں شک نہیں کہ نیکی کا ملکہ راسخ ہو جانے اور بلند عقلی مراتب پر پہنچ جانے کے بعد یہ ممکن ہے کہ انسان فائدے اور نقصان کے تصور سے خالی الذہن ہو کر نیکی محض نیکی کی خاطر کرنے لگے اور بدی سے محض اسکے بدی ہونے کی بنا پر مجتنب رہے، لیکن اول تو یہ فقط مبدئِ خیر و شر کی طرف سے ذہول ہے نہ کہ اس کی مبدائیت کا سبب دوسرے یہ محض فلسفیوں کے تخیل کی معراج ہے جس تک پہنچنا بڑے بڑے علماء کو بھی نصیب نہیں ہوا ہے، پھر بھلا عام انسان مجرد نیکی کے اختیار اور مجرد بدی سے اجتناب کو اپنا نصب العین کیونکر بنا سکتے ہیں؟

اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ نیکی اور بدی کے تصور کو فائدے اور نقصان کے تصور سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ نیکی فی نفسہ انسان کی مراد نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کی تہ میں کوئی فائدہ مضمّن نہ ہو، اور بدی بذاتِ خود قابلِ احتراز قرار نہیں پاسکتی تا وقتیکہ اس کے باطن میں کوئی

نقصان پوشیدہ نہ ہو۔ اب اگر ہم تقویٰ اور نیکو کاری کو خود غرضی کے ادنیٰ مرتبے سے اٹھا کر بے نفسی اور خلوص کے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچاتا اور اسے ایک ایسے ضابطہ اخلاق کی بنیاد قرار دیتا چاہیں جو عوام و خواص سب کے لئے ہو، تو اس کی بہترین صورت یہی ہے کہ فائدے اور نقصان کا ایک ایسا معیار قائم کیا جائے جو مادیت اور نفسانیت سے بالاتر ہو، جس کی بنیاد پر تمام مادی اور نفسانی نقصانات سے لبریز ہونے کے باوجود ایک نیک عمل انسان کی نگاہ میں سراسر فائدوں سے مملو نظر آئے، اور ہر قسم کی منفعتوں سے پُر ہونے کے باوجود ایک بُرا عمل اس کو سرتاپا نقصان محسوس ہو۔ یہی طریقہ اسلام نے اختیار کیا ہے اس نے رضائے الہی کے حصول و عدم حصول کو فائدے اور نقصان کا معیار قرار دیا ہے جو مادی اور نفسانی آلائشوں سے بالکل پاک ہے اس معیار کے مطابق ایک نیکو کار انسان اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان، مال، اولاد، نیک نامی، شہرت ہر چیز کو قربان کر کے بھی یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ فائدہ میں ہے اور ایک بدکار انسان خدا کا غضب مول لینے کے بعد دنیا کے تمام مادی اور نفسانی فوائد حاصل کر کے بھی یہ خوف رکھتا ہے کہ وہ نقصان میں ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو تمام دنیوی فائدوں اور نقصانوں سے بے نیاز کر کے خلوص نیت کے ساتھ تقویٰ اور نیکو کاری اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

یہاں تک دو امور کی تشریح کی جا چکی ہے۔ ایک یہ کہ اسلام نے کس چیز کو زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے؟ دوسرے یہ کہ وہ کن وجوہ سے ایک بہترین نصب العین ہے؟ اب ہمیں اس مسئلہ کے تیسرے پہلو کی طرف نظر کرنی چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو ایک مخصوص تہذیب بنانے میں اس نصب العین کا کیا حصہ ہے اور اس نے

اس تہذیب کو کون سی خصوصی شان بخشی ہے ؟
طریقوں کے امتیاز میں مقصد کی تعیین کا اثر

پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات میں جس طرح مقصد کی تعیین ضروری ہے اُس طرح طریق حصول مقصد کی تعیین بھی ضروری ہے۔ اور طریقہ کی تعیین، مقصد کی مناسبت کے سوا کسی اور بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی شخص کے پیش نظر نفسی سلوک و سیر کے سوا کوئی متعین شے مقصود نہ ہو اور وہ محض راستوں اور گلیوں کی خاک چھانتا پھرے تو ہم اس کو مجنون یا آوارہ گرد کہتے ہیں اور اگر وہ مقصد تو رکھتا ہو، لیکن اس کی تحصیل کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کا پابند نہ ہو، بلکہ ہر اس طریقہ پر چلنے کے لئے تیار ہو جائے جس پر اسے موصل الی المقصود ہونے کا گمان ہو، تو اس کو بھی ہم احمق قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ از روئے عقل ایسا شخص کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا جو ایک مقام کی طرف جانے کے لئے دس مختلف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتا ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنا مقصود تو کسی چیز کو قرار دے اور راستہ ایسا اختیار کرے جو اس کے مخالف سمت میں جانے والا ہو، تو اس کو بھی ہم صاحب عقل نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اس اعرابی کے مانند ہے جو کعبہ کی طرف جانے کیلئے ترکستان کی راہ پر چل رہا ہو پس انسان کی عملی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ وہ سلوک کے لئے پہلے ایک مقصد متعین کرے، پھر اپنی نیتوں اور کوششوں کا رخ اسی مقصد کی طرف پھیر دے، اور اگر اس مقصد تک پہنچنے کے بہت سے راستے ہوں تو ان میں سے ایک راستہ اختیار کر لے جو اس کے نزدیک بہترین ہو، اور اس کے سوا دوسرے تمام راستوں کو چھوڑ دے۔

یہ ترک و اختیار عین مقتضائے عقل ہے۔ مقصد کی تعیین کا عقلی نتیجہ یہی ہے کہ جو طریقہ اس مقصد سے خاص طور پر مناسبت رکھتا ہو اس کو اختیار کیا جائے اور دوسرے تمام طریقوں کو ترک کر دیا جائے۔ ایک صاحب عقل آدمی جب سفر کرتا ہے تو اسی ایک راستہ پر چلتا ہے جو منزل مقصود تک پہنچانے والے راستوں میں سب سے بہتر ہو۔ اس کے ساتھ اور بیسیوں راستے جو اس کو دوران سفر میں ملتے ہیں ان کی طرف و التفات بھی نہیں کرتا۔ ایک عقلمند طالب علم اپنے لئے علم کا وہی شیخ اختیار کرتا ہے جو اس کے نصب العین کی تحصیل میں سب سے زیادہ مددگار ہوتا ہے۔ دوسرے جتنے شعبے اس سے غیر متعلق ہوتے ہیں ان میں اپنا وقت اور اپنا دماغ کھپانا پسند نہیں کرتا۔ ایک زیرک و ذی سوداگر اپنے لئے کاروبار کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو اسکے نزدیک حصول مراد کا بہترین وسیلہ ہو سکتا ہو۔ ہر کام میں اپنا سرمایہ لگانا ہر پیشہ میں اپنی محنت صرف کرنا وہ حماقت سمجھتا ہے۔ اس ترک اختیار کے فعل پر ایک نقاد اگر بحث کر سکتا ہے تو صرف اس حیثیت سے کہ جو راستہ اختیار کیا گیا ہے وہ مقصود تک پہنچانے کے لئے بہترین ہے یا نہیں؟ لیکن نفس ترک و اختیار پر کوئی اعتراض ممکن نہیں ہے۔

یہ اصل جس طرح زندگی کے جزئی معاملات پر منطبق ہوتی ہے اسی طرح من حیث المجموع پوری زندگی پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہ رکھتا ہو، یا بالفاظ دیگر جینے سے اس کا مقصد محض جینا ہو تو وہ آزاد ہے کہ زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ چاہے اسے کرے۔ اس کے لئے طریقوں کے درمیان اچھے اور بُرے، صحیح و غلط، اعلیٰ اور اسفل کا امتیاز محض بے معنی ہے۔ وہ اپنی خواہشات

حاجات کو جس طرح چاہے پورا کر سکتا ہے۔ بیرونی اسباب کسی حد تک اسے ایک خاص طریقہ کی پابندی پر مجبور بھی کریں تو یہ اس کی زندگی کو کسی نظم اور ضابطہ کے تحت لانے میں کارگر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انضباط کا کوئی مبداء محرک خود اس کے اپنے نفس میں موجود نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنے پیش نظر زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، یا زیادہ صحیح الفاظ میں زندگی کے حیوانی طبیعی مقصد سے بالاتر کوئی عقلی انسانی مقصد اس کے ذہن میں جاگزیں ہو، تو لازماً وہ طریقوں کے درمیان امتیاز کرے گا اور اگر حقیقت میں وہ ایک صاحب عقل انسان ہے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ کو جو اس کے مقصد کی تحصیل کے لئے زیادہ مناسب ہو اختیار کرے۔ ایک مقصد متعین کر لینے کے بعد طریقوں میں وہی آزادی رہتا جو صرف ایک بے مقصد انسان کا حق ہے، اس کے لئے کسی طرح بائز نہ ہوگا۔

اب اس قاعدے کو ذرا وسیع کیجئے۔ فرد کی جگہ جماعت کو لے کر دیکھیئے۔ یہی قاعدہ بالکل اسی طرح مجموعہ افراد پر بھی جاری ہوتا ہے۔ جب تک کوئی جماعت مدنیت کے ابتدائی مدارج میں ہوتی ہے، اور زندگی کے حیوانی طبیعی مقاصد سے اعلیٰ و ارفع کوئی مقصد اس کے پیش نظر نہیں ہوتا، وہ اپنے طور طریقوں میں اُسی طرح آزاد رہتی ہے جس طرح ایک بے مقصد انسان ہوا کرتا ہے۔ مگر جب ایک ارتقاء عقلی اور تہذیب مدنی کے زیادہ اُونچے مدارج پر پہنچ کر اس میں ایک تہذیب پیدا ہو جاتی ہے، اور وہ تہذیب اس کے لئے اجتماعی زندگی کا کوئی عقلی مقصد متعین کر دیتی ہے، تو یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اس مقصد کی مناسبت سے عقائد، تصورات، معاملات، اخلاق، معاشرت،

معیشت وغیرہ کے لئے ایک خاص نظام وضع کیا جائے، تہذیب کے متبعین کو اس نظام کا پابند بنایا جائے اور ان کے لئے اس امر کی آزادی باقی نہ رہنے دی جائے کہ وہ اس کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی ایسے عقیدہ یا طرز عمل کو اختیار کر لیں جو اس نظام سے خارج ہو اپنے اس ضابطہ کی حفاظت میں سختی کرنا تہذیب کی فطرت کا عین مقتضاء ہے۔ اس باب میں جس تہذیب کی گرفت ڈھیلی ہوگی اور جس کی قوت ضابطہ میں ضنعت اور سُستی پائی جائے گی، وہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تہذیب کا وجود منحصر ہے اس پر کہ عقیدہ اور عمل کا جو نظام اس نے وضع کیا ہے اس کے متبعین اس کی پابندی کریں جب متبعین میں اس کی پابندی ہی نہ ہوگی اور اس نظام سے باہر کے تصورات اور طور طریقے ان کے ذہن اور ان کی عملی زندگی پر قابض ہو جائیں گے تو تہذیب کا کوئی واقعی وجود باقی نہ رہے گا۔ لہذا ایک تہذیب اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے اور دوسرے خارجی نظامات سے علیحدگی پر اصرار کرنے میں بالکل حق بجانب ہے۔ نقاد اگر کچھ کلام کر سکتا ہے تو اس کے مقصد کے صحیح یا غلط ہونے پر کر سکتا ہے، یا اس پر کر سکتا ہے کہ اس مقصد کیلئے یہ خاص طریقہ مناسب ہے یا نہیں، یا اس پر کر سکتا ہے کہ اس نظام کی پابندی تمام حالات میں ممکن ہے یا نہیں، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس تہذیب کو اپنے متبعین سے اپنے وضع کردہ نظام کی پابندی کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

پھر جب یہ قاعدہ مسلم ہو چکا ہے کہ ذہنی اور عملی زندگی کے لئے جو خاص طریقے اور نتائج متعین کیئے جاتے ہیں ان کی تعیین دراصل مقصد کی نوعیت پر مبنی ہوتی ہے، اور مقصد کے اختلاف سے طریقوں

اور منہجوں کا مختلف ہونا ضروری ہے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ جو تہذیبیں اپنے مقاصد میں مختلف ہوں ان کے اعتقادی اور عملی نظامات لازمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہونے چاہئیں۔ یہ ممکن ہے کہ وہ نظام اپنے بعض اجزاء میں باہم متشابہ ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نظام میں بعض جزئیات دوسرے نظام سے آگئی ہوں، لیکن نہ تو جزئی تشابہات سے کلی موافقت کا حکم نکالا جاسکتا ہے اور نہ جزئیات کے مستعار لینے سے کل کا مستعار ہونا لازم آتا ہے۔

اسی اصل سے دو قاعدے اور نکلتے ہیں :-

ایک یہ کہ ایک خاص مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو جانچنے کے لئے دوسری جداگانہ مقصد رکھنے والی تہذیب کے نظام کو معیار نہیں بنایا جاسکتا۔ یعنی تنقید کا یہ طریقہ درست نہیں ہے کہ یہ نظام اگر اس نظام سے مطابقت رکھتا ہے تو صحیح ہے ورنہ غلط۔

دوسرے یہ کہ ایک تہذیب کو بجائے خود باقی رکھتے ہوئے اس کے اعتقادی اور عملی نظام کو دوسرے نظام سے نہیں بدلا جاسکتا اور نہ ایک نظام کے اساسی اجزاء دوسرے نظام میں داخل کیے جاسکتے ہیں جو شخص اس قسم کے خلط ملط کو ممکن یا درست سمجھتا ہے۔ وہ تہذیب کے اصول سے ناواقف ہے اور اس کے مزاج کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اس کے نصب العین کا حصہ ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی تہذیب کو ایک بالکل جداگانہ اور مخصوص تہذیب بنانے میں اس کے نصب العین کا کیا حصہ ہے؟ پچھلے مباحث میں یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی چکی ہے کہ اسلام نے زندگی کا جو نصب العین مقرر کیا ہے

وہ دوسرے ادیان اور دوسری تہذیبوں کے نصب العین سے اصلاً مختلف ہے۔ اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ مقصد کے اختلاف سے اعتقاد و عمل کے نظام میں بنیادی اختلاف واقع ہو جاتا ہے۔ لہذا اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے نصب العین نے اس کو ایک ایسی مخصوص تہذیب بنا دیا ہے جو بنیادی طور پر دوسری تہذیبوں سے مختلف ہے اور جس کا اعتقادی و عملی نظام دوسرے نظامات سے اساسی اختلاف رکھتا ہے یہ ممکن ہے کہ اس نظام کے بعض اجزاء دوسرے نظامات میں بھی پائے جاتے ہوں، لیکن یہاں وہ اجزاء بعینہ اُس حیثیت سے مندرج نہیں ہیں جس حیثیت سے وہ دوسرے نظامات میں مندرج ہیں۔ کسی نظام میں مندرج ہونے کے بعد جز اپنی شخصی طبیعت کو گم کر کے کل کی طبیعت اختیار کر لیتا ہے اور جب ایک کل کی طبیعت دوسرے کل سے مختلف ہو تو لازماً اس کے ہر جزو کی طبیعت بھی دوسرے کے ہر جزو کی طبیعت سے مختلف ہوگی، خواہ اس کے بعض اجزاء اپنی ظاہری شکل میں دوسرے کے بعض اجزاء سے کتنی ہی مشابہت رکھتے ہوں۔

جیسا کہ بیان کیا چکا ہے اسلام نے انسان کو دُنیا میں خدا کا نائب قرار دیا ہے اور اسکی زندگی کا مقصد یہ متعین کیا ہے کہ جس آقا کا وہ نائب ہے اس کی خوشنودی حاصل کرے۔ یہ مقصد چونکہ عین اس کی زندگی کا مقصد ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال کا رخ اسی مقصد کی طرف پھر جائے۔ اس کے نفس اور اس کے جسم کی تمام قوتیں اسی مقصد کی راہ میں صرف ہوں۔ اس کے خیالات و تصورات اور حرکات و سکنات پر اسی مقصد کی حکومت ہو۔ اس کا جینا اور مرنا، اس کا سونا اور جاگنا، اس کا کھانا اور پینا، اس کے معاملات اور تعلقات، اسکی دوستی اور دشمنی، اس کی معیشت اور معاشرت، غرض اس کی ہر چیز اسی ایک

مقصد کے لئے ہو۔ اور یہ مقصد اس کے اندر اس طرح ساری و جاری ہو جائے کہ گویا وہی اس کی وہ رُوح ہے جس کی بدولت وہ زندہ اور متحرک ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد رکھتا ہو، اور اسی مقصد کے لئے زندہ ہو، وہ اس شخص کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا جس کے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو اس مقصد سے مختلف ہو۔ یہ مقصد تو اپنی عین فطرت کے اعتبار سے انسان کو ایک عامل اور کارکن ہستی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسا عامل اور کارکن جو زندہ ہے صرف اس لئے کہ اپنے زندگی کے مقصد کو حاصل کرے۔

پس یہ مقصد متعین کرنے کے بعد اسلام زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے ایک خاص طریقہ کو انتخاب کرتا ہے اور انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اس طریقہ کے سوا کسی اور طریقہ پر چل کر اپنے عزیز وقت اور اپنی قیمتی طاقتوں کو ضائع نہ کرے۔ وہ اس مقصد کے طبعیت و فطرت کے مطابق عقائد اور اعمال کا ایک جداگانہ نظام وضع کرتا ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اس خاص نظام سے کسی حالت میں باہر نہ جائے۔ وہ اس نظام کو سراسر اطاعت اور عین انقیاد قرار دیتا ہے، اس لئے اس کا نام ہی ”دین“ رکھ دیتا ہے جس کے معنی اطاعت اور انقیاد کے ہیں۔ وہ کہتا ہے:-

۱۰ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (آل عمران-۲)

”دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔“

اسی دین کی بنیاد پر وہ اپنے متبعین اور غیر متبعین کے درمیان خط امتیاز کھینچتا ہے۔ جو لوگ اس خاص مقصد کے تحت اس نظام دینی کا اتباع کرتے ہیں ان کو وہ ”مسلم“ (اطاعت کرنیوالے) اور ”مومن“ (ماننے والے) کہتا ہے۔ اور جو اس مقصد سے متفق نہیں ہیں اور اس

نظام دین کا اتباع نہیں کرتے ان کو ”کافر“ (انکار کرنے والا) قرار دیتا ہے۔ وہ نسل، قوم، زبان، وطن اور ایسے ہی دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر اولادِ آدم میں صرف اسی ایک کفر و ایمان کے امتیاز کو قائم کرتا ہے۔ جو کوئی اس کے نظام کا اتباع کرے وہ اس کا اپنا ہے، خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اور جو اس کے نظام کا اتباع نہ کرے وہ غیر ہے، خواہ وہ عین کعبہ کی دیوار ہی کے نیچے کیوں نہ رہتا ہو، اور اس کی ہڈی بوٹی مکہ کی کھجوروں اور زمزم کے پانی ہی سے کیوں نہ بنی ہو۔

جس طرح اُس نے عقائد اور اعمال کی بنا پر انسانوں کے درمیان ”کفر“ اور ”ایمان“ کا امتیاز قائم کیا ہے اُسی طرح زندگی بسر کرنے کے طریقوں اور دنیا کی تمام چیزوں کے درمیان بھی اُس نے حرام اور حلال، جائز اور ناجائز، مکروہ اور مستحب کا امتیاز قائم کیا ہے۔ جو اعمال اور طور طریقے اس مقصد کی تحصیل اور فرائضِ خلافت کی بجا آوری میں مددگار ہیں وہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مستحب ہیں یا حلال ہیں یا جائز

۱۔ لفظ کافر کے استعمال میں بھی بے تغیر بلاغت سے کام لیا گیا ہے۔ نعتِ عرب میں ”کفر“ کے بنیادی معنی چھپانے کے ہیں۔ اسی لئے رات کو ”کافر“ کہا جاتا ہے کہ وہ چیز اور کو چھپا دیتی ہے۔ اور کسان کو بھی کافر کہتے ہیں کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اور خوشے کو کافر کہتے ہیں کہ وہ پھل کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ پھر استعارہ کے طور پر نعت کو چھپانے اور اس کا شکر ادا نہ کرنے کو ”کفر“ اور ”کفران“ کہا گیا ہے۔ اسلام ۱۔ اس لفظ کو ایمان کی ضد قرار دیا ہے۔ جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں وہ دراصل اپنی فطرت اور

تنت پر پردہ ڈالتے ہیں۔“

اور جو اس میں مزاحم اور مانع ہیں وہ اپنے مرتبہ کے لحاظ سے مکروہ ہیں یا ناجائز یا حرام۔ جو مومن اس خط امتیاز کا احترام کرے وہ ”متقی“ (پہیز گار) ہے اور جو اس کا احترام نہ کرے وہ ”فاسق“ (حدود سے نکل جانے والا) ہے۔ اللہ کی پارٹی کے لوگوں میں ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز مال دولت، یا حسب و نسب، یا مراتب معاشرت، یا رنگ کی سیاہی و سپیدی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ صرف ”تقویٰ“ کی بنا پر ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیكُمْ (الحجرات-۲)۔

اس طرح تصورات و افکار، اخلاق و خصائل، معیشت و معاشرت تمدن و عمران، سیاست و حکومت، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی تہذیب کا راستہ دوسری تہذیبوں کے راستہ سے الگ ہو جاتا ہے۔ زندگی کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسری تہذیبوں کے نظریہ سے الگ ہے۔ زندگی کا مقصد اسلام کے نزدیک اُس مقصد سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے متعین کیا ہے۔ لہذا اسلام اپنے نظریہ کے مطابق دنیا اور مافیہا سے جو معاملہ برتنا ہے، اور اپنے مقصد کی تحصیل کے لئے دنیوی زندگی میں جو طریقہ اختیار کرتا ہے، وہ بھی بنیادی طور پر اس معاملہ اور اس طریقہ سے مختلف ہے جو دوسری تہذیبوں نے اختیار کیا ہے۔ ذہن کے بہت سے افکار و تصورات، نفس کے بہت سے میلانات و رجحانات، اور زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ایسے ہیں جن کا اتباع دوسری تہذیبوں کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ بسا اوقات لازمہ تہذیب ہے۔ مگر اسلام ان کو ناجائز، مکروہ اور بعض حالات میں حرام قرار دینے پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ وہ ان تہذیبوں کے تصور حیات سے عین مطابقت رکھتے ہیں اور ان کے مقصد زندگی کی تحصیل میں مددگار ہوتے ہیں، مگر اسلام کے تصور حیات سے ان کو کوئی لگاؤ

نہیں ہے یا اس کے مقصد زندگی کی تحصیل میں وہ مانع ہیں۔ مثال کے طور پر فنون لطیفہ دنیا کی بہت سی تہذیبوں میں جان تہذیب ہیں اور ان فنون میں اعلیٰ جہارت رکھنے والوں کو قومی ہیرو کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے مگر اسلام ان میں سے بعض کو حرام، بعض کو مکروہ، اور بعض کو ایک حد تک جائز قرار دیتا ہے۔ اس کے قانون میں ذوق لطیف کی پرورش اور جمال مصنوعی سے لطف اندوزی کی اجازت صرف اس حد تک ہے جہاں انسان اس کے ساتھ ساتھ خدا کو یاد رکھ سکے، اس کی رضا جوئی کے لئے عمل کر سکے، اپنے منصب خلافت کے فرائض بجالا سکے مگر جس مقام پر یہ ذوق لطیف احساس فرض پر غالب آجاتا ہو، جہاں لطف اندوزی کا انہماک انسان کو خدا پرست کے بجائے حسن پرست بنا دیتا ہو، جہاں فنون لطیفہ کی چاشنی سے انسان کو عیش پسندی کا چسکا لگ جاتا ہو، جہاں ان فنون کے اثر سے جذبات و داعیات نفس اس قدر قوت و شدت حاصل کر لیتے ہوں کہ عقل کی گرفت ڈھیلی ہو جائے اور ضمیر کی آواز کے لئے دل کے کان بہرے ہو جائیں اور فرض کی پکار کے لئے سمع و طاعت باقی نہ رہے، ٹھیک اسی سرحد پر اسلام عدم جواز، کراہت اور حرمت کے موانع قائم کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد تان سین اور بنداوین، مانی اور بہزاد، چارلی چپلن اور میری پکفورڈ پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ وہ ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ، علی بن ابی طالبؓ اور حسین ابن علیؓ، ابوذر غفاریؓ اور رابعہ بصریہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہی حال معاشرت اور تمدن کے اور بہت سے معاملات میں بھی ہے جن کی تفصیلات کو اوپر کی مثال پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مردوں اور عورتوں کے تعلقات، مالدار اور مفلس کے معاملات، راعی اور رعیت کے روابط، اور انسانی طبقات کے باہمی برتاؤ کے متعلق

اسلام کا طریقہ تمام قدیم اور جدید تہذیبوں کے طریقہ سے اصولی طور پر مختلف ہے۔ اس باب میں دوسری تہذیبوں کے نظام کو معیار قرار دینا اور اسلام کے نظام کو اس پر جانچنے کی کوشش کرنا اصلاً غلط ہے جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ سطح بین اور حقیقت نا آشنا ہیں۔

باب سوم

اساسی افکار و عقائد

۱۔ ایمان کی حقیقت و اہمیت

سیرت اور اس کی ذہنی بنیاد۔

تنظیم عمل کی پہلی شرط۔

ایمان کے معنی۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا مرتبہ۔

ایمان کی دو قسمیں۔

۱۔ مذہبی ایمان۔ ۲۔ دنیوی ایمان۔

چند اصول کلیہ۔

۲۔ اسلام کے ایمانیات

عقلی تنقید۔

اسلام میں ایمان کی اہمیت۔

عمل پر ایمان کا تقدم۔

خلاصہ۔

ایک اعتراض۔

اعتراض کی تحقیق۔

۳۔ ایمان باللہ

ایمان باللہ کی اہمیت

ایمان باللہ کا تفصیلی عقیدہ۔

ایمان باللہ کے اخلاقی فوائد۔

۱۔ وسعتِ نظر۔

۲۔ عزتِ نفس۔

۳۔ انکسار و تشخّش۔

۴۔ غلط توقعات کا ابطال۔

۵۔ رجائیت اور اطمینانِ قلب۔

۶۔ صبر و توکل۔

۷۔ شجاعت۔

۸۔ قناعت و استغناء۔

۹۔ اصلاحِ اخلاق و تنظیمِ اعمال۔

۲۔ ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ کا مقصد۔

نظامِ وجود میں فرشتوں کی حقیقت۔

انسان اور فرشتوں کی اضافی حیثیت۔

۵۔ ایمان بالترسل

حقیقتِ رسالت۔

رسول اور عام رہنماؤں کا فرق۔

ایمان باللہ اور ایمان بالترسل کا تعلق۔

وحدتِ کلمہ۔

اتباع و اطاعتِ رسول۔

عقیدہ رسالت کی اہمیت۔

رسالتِ محمدیؐ کے امتیازی خصائص۔

پچھلی نبوتوں اور رسالتِ محمدیؐ کا فرق۔

دعوتِ عام۔

تکمیلِ دین۔

نسخِ ادیانِ سابقہ۔

ختمِ نبوت۔

عقیدہ محمدی کے لازمی اجزاء۔

۴۔ ایمان بالکتاب

رسالت اور کتاب کا تعلق۔

پیرایہ اور رہنما کی قرآنی مثال۔

تمام کتبِ آسمانی پر ایمان۔

صرف قرآن کا اتباع۔

قرآن کے متعلق تفصیلی عقیدہ۔

جامعہ اسلامی کا سنگِ بنیاد۔

۵۔ ایمان بالیومِ الآخر

چند فطری سوالات۔

جہلتِ اخروی کا انکار۔

اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر۔

نظریہ تناسخ۔

عقلی تنقید۔

تمدن پر عقیدہ تناسخ کا اثر۔

حیاتِ اخروی کا عقیدہ۔

عقلی تحقیق کا صحیح طریقہ۔

حیاتِ اخروی پر منکرین کا اعتراض۔

قرآن مجید کا طرزِ استدلال۔

حیاتِ اخروی پر امکان۔
 نظامِ عالم ایک حکیمانہ نظام ہے۔
 حکیمانہ نظام بے مقصد اور بھل نہیں ہو سکتا۔
 اقتضائے حکمت کے مطابق نظامِ عالم کا کیا انجام ہونا چاہیئے۔
 نظامِ عالم کا خاتمہ۔

حیاتِ اخروی کا نظام کیا ہوگا۔
 اعتقادِ یومِ آخر کی ضرورت۔
 دنیا پر آخرت کی ترجیح۔
 نامہ اعمال اور عدالت۔
 اعتقادِ یومِ آخر کا فائدہ۔

۸۔ اسلامی تہذیب میں ایمان کی اہمیت

ایمانیات پر مجموعی نظر۔
 تہذیبِ اسلامی کا خاکہ۔
 تہذیبِ اسلامی میں ایمان کی اہمیت۔
 نفاق کا خطرہ۔

ضمیمہ ۱۱۔

زندگی بعد موت۔

اساسی افکار و عقائد

۱۔ ایمان کی حقیقت و اہمیت

نظریہ حیات اور مقصد حیات سے گزر کر اب ہمارے سامنے تیسرا سوال آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام نے انسانی سیرت کی تعمیر کس بنیاد پر کی ہے؟

سیرت اور اس کی ذہنی بنیاد

انسان کے جملہ اعمال و افعال کا سرچشمہ اس کا ذہن ہے۔ مہدٰ افعال ہونے کی حیثیت سے ذہن کی دو حالتیں ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ اس میں کسی خاص قسم کے خیالات راسخ نہ ہوں۔ مختلف پراگندہ اور منتشر خیالات آتے رہیں اور ان سے جو خیال بھی قوی ہو وہی عمل کیلئے متحرک بن جائے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ وہ پراگندہ خیالی کی آماجگاہ نہ رہے بلکہ چند مخصوص خیالات اس میں اس طرح راسخ ہو جائیں کہ اس کی عملی زندگی مستقل طور پر انہی کے زیر اثر ہو، اور اس سے منتشر اعمال سرزد ہونے کے بجائے مرتب اور منضبط اعمال صادر ہوا کریں۔ پہلی حالت کو ہم ایک سڑک سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہر آئندہ و روند کے لئے کھلی ہوئی ہے، کسی وارد و صادر کی اس میں تخصیص نہیں۔ دوسری حالت ایک ایسے سانچہ کی سی ہے جس میں سے ہمیشہ ایک متعین شکل و ہیئت کے پٹرنزے ڈھل کر نکلتے ہیں۔ جب انسان کا ذہن پہلی حالت میں ہوتا ہے

تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کوئی سیرت نہیں ہے۔ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے اور فرشتہ بھی۔ اس کی طبیعت میں تلون ہے۔ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ اس سے کب کس قسم کے افعال کا صدور ہو۔ بخلاف اس کے جب وہ دوسری حالت میں آجاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ اپنی ایک سیرت رکھتا ہے۔ اس کی عملی زندگی میں ایک نظم ہے۔ ایک ترتیب ہے۔ اعتماد کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کن حالات میں کیا فعل کرے گا۔

تنظیم عمل کی پہلی شرط

پس معلوم ہوا کہ انسان کی عملی زندگی کا ایک قابل اعتماد نظم و ترتیب اختیار کرنا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل سیرت بن جائے، اور سیرت کے بننے کا انحصار اس پر ہے کہ اس کا ذہن پراگندہ خیالی کی حالت سے نکل جائے، چند مخصوص خیالات اس کے اندر متمکن ہو جائیں، اور ان خیالات میں اتنا رسوخ، اتنا جماؤ، اتنی مضبوطی ہو کہ کسی دوسری طرح کے خیالات کو آنے اور ذہن کی دنیا میں برہمی پیدا کرنے کا موقع نہ دیں۔ یہ خیالات جتنے زیادہ گہرے جمے ہوئے ہوں گے، سیرت اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی، اور انسان کی عملی زندگی اتنی ہی زیادہ مرتب، منظم اور قابل اعتماد ہوگی۔ برعکس اس کے ان میں جتنی کمزوری ہوگی، مخالف خیالات کو راہ دینے کی جتنی زیادہ صلاحیت ہوگی، اتنی ہی سیرت بھی کمزور ہوگی، اور عملی زندگی بھی اسی قدر بے نظم اور ناقابل وثوق ہو جائے گی۔

ایمان کے معنی

قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی اسی ذہنی بنیاد کا نام ”ایمان“ ہے۔ ایمان کا لفظ مادہ ”امن“ سے نکلا ہے۔ امن کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے امانت ہے جو ضد

ہے خیانت کی۔ یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اسی لئے کہتے ہیں کہ اسکی نیک معاملگی پر دل ٹھک جاتا ہے، وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہ کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اُس کو اُمُون کہتے ہیں، کیونکہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اسی مادے کا باب افعال ”ایمان“ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جمالی جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا، اُس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوتی اور اس نے عملی زندگی میں بے نظمی پیدا کر دی۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا عکس ہے۔ مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس اور یقینی بنیادوں پر قائم ہوگئی، اب اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ اعمال ٹھیک ٹھیک اُس تخیل اور اُس مفکرہ کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے اور جس سے سیرت کا سانچہ تیار ہوا ہے۔

تہذیب کی تاسیس میں ایمان کا مرتبہ

اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کی سیرتیں مختلف و متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی

کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیئے گئے اور ایک مضبوط دیوار قائم ہو گئی۔ اب انکے درمیان تعامل و تعاون شروع ہو جائے گا جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں یک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہوگا۔ ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی۔ ایک نئی قوم نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات، نئے طریق عمل کے ساتھ اُٹھے گی اور اپنی تہذیب کا قہر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے گی۔

اس تقریر سے آپ نے سمجھ لیا کہ ایک تہذیب میں اُس اُساسی تخیل کا کیا مرتبہ ہے جو اجتماعی طور پر اس تہذیب کے متبعین میں ایمان بن کر راسخ ہو جائے۔

ایمان کی دو قسمیں

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ایمان کے اعتبار سے دنیا کی مختلف تہذیبوں کا کیا حال ہے۔ ایمان کا لفظ اصل میں تو ایک مذہبی اصطلاح ہے، مگر چونکہ یہاں ہم اس کو اُساسی تخیل کے معنی میں بول رہے ہیں، اس لیے اس معنی میں ایمان کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ایک وہ ایمان جو مذہبی نوعیت رکھتا ہو۔ مذہبی نوعیت کا ایمان صرف اُس تہذیب کی اُساس بن سکتا ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو، کیونکہ اس صورت میں ایک ہی ایمان دین اور دنیا دونوں پر حکمران ہوتا ہے۔ مگر جس تہذیب کی بنیاد مذہب پر نہ ہو اس میں دنیوی ایمان مذہبی ایمان سے الگ ہو جاتا ہے اور مذہبی ایمان کا شخصی و قومی زندگی پر کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

۱۔ مذہبی ایمان

مذہبی ایمان عموماً ایسے امور پر ہوتا ہے جو انسانی سیرت کو روحانی

اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرتے ہیں۔ مثلاً ایک یا متعدد معبود جن سے مخصوص صفات سے متصف کیا گیا ہو، کتابیں جن کا الہامی ہونا تسلیم کر لیا گیا ہو، اور پیشوا جن کی تعلیم اور سنت پر اعتقاد و عمل کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ دینی نقطہ نظر کو چھوڑ کر خالص دنیوی نقطہ نظر سے اس قسم کے ایمان کی کامیابی دو چیزوں پر منحصر ہے۔ ایک یہ کہ مذہب سے جن امور کی تصدیق کرنے اور جن پر یقین کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ عقلی اعتبار سے قابل تصدیق ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایسے امور ہوں جن کی بنیاد پر انسانی سیرت کی تعمیر صحیح طور سے ہو سکتی ہو۔ وہ سیرت کو اس طرح سے بنائیں کہ اس کی روحانیت ایک اعلیٰ درجہ کے نظام اخلاقی کی تاسیس کرنے والی ہو، اور اس کا اخلاق اپنی کمال و جہارت کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے مستعد کرنے والا ہو۔

پہلی شرط اس لئے ضروری ہے کہ اگر ایمانیات محض اوہام کا مجموعہ ہوں، یا ان میں اوہام زیادہ اور معقولات کم ہوں تو انسان کے فطرت پر ان کا استیلاء کلیتہً جہالت و نادانی کا زیر بار منت رہے گا۔ چونکہ ارتقاء عقلی کے بلند مدارج کی طرف انسان نے قدم اٹھائے ہیں اور اوہام باطلہ کا طلسم ٹوٹنا شروع ہو جائے گا، ایمان کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں گی، اور اس کے ساتھ ہی روحانیت اور اخلاق کا سارا نظام بھی درہم برہم ہوتا چلا جائے گا جس پر شخصی اور قومی سیرت کی بنیادیں اٹھانی گئی تھیں۔ اس کی مثال میں ہم ان اعتقادات کو پیش کر سکتے ہیں جو مختلف مشرکانہ مذاہب نے دیوتاؤں، معبودوں، خداؤں اور پیشواؤں کے متعلق پیش کیئے ہیں۔ ان کو جن صفات سے متصف کیا گیا ہے، جو افعال ان کی طرف منسوب کیئے گئے ہیں، جو افسانے

کے متعلق گھڑے گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ عقل سلیم ان کی تصدیق کرنے اور ان پر ایمان لانے سے انکار کرتی ہے۔ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ ان پر اعتقاد رکھنے والی قوم دنیا میں ترقی اور غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں ہوتی۔ باطل اوہام اس کے ذہن پر ایسا بُرا اثر ڈالتے ہیں کہ عمل کی بہترین قوتیں ٹھٹھکر رہ جاتی ہیں۔ نہ حوصلوں میں بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ عزائم میں شدت، نہ نگاہ میں وسعت، نہ دماغ میں روشنی نہ دل میں جرأت۔ آخر کار یہی چیز اس قوم کے لئے دائمی نکتہ، ذلت، مقہوری اور غلامی کا سبب بن جاتی ہے۔ برعکس اس کے جن قوموں پر کچھ دوسرے اسباب سے ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں وہ عقل و علم کے اعتبار سے جتنی ترقی کرتی جاتی ہیں اپنے خداؤں، معبودوں اور پیشواؤں پر سے ان کا اعتقاد اٹھتا جاتا ہے۔ اول اول محض نظام اجتماعی کے تحفظ کی خاطر ان غلط ایمانیات کو مصلحتاً برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے خلاف دل اور دماغ کی بغاوت اتنی شدید ہو جاتی ہے کہ آخر کار قوم کے ذہن پر ان کے لئے کوئی گرفت باقی نہیں رہتی۔ صرف ایک مختصر سا روحانی گروہ انہیں پر حقیقی یا پیشہ وارانہ یقین رکھنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور باقی ساری قوم کے نفس و روح پر ایک دوسرے ایمان کا تسلط ہو جاتا ہے جس کو ہم نے دنیوی ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شرط کا ضروری ہونا بالکل ظاہر ہے۔ جو ایمانیات انسان کو دنیوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں کر سکتے ان کا اثر محض روحانی اور اخلاقی زندگی تک محدود رہتا ہے مادی زندگی تک نہیں پہنچنے پاتا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ بھی دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو ان کی بدولت وہ قوم ترقی ہی نہ کرے گی جو ان کی معتقد ہو

گی۔ یا ترقی کرے گی تو بہت جلد ان کی گرفت سے نکل جائے گی، مذہب کا ایمان ہندو کے ایمان کے لئے جگہ خالی کر دے گا، اور جب مادی زندگی کی سعی و عمل میں قوم کا انہماک بڑھے گا تو اخلاق و روحانیت بھی مذہبی ایمانیات کے اثر سے آزاد ہو جائیں گے۔

میں عمداً کسی مذہب کی تنقید نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے تفصیل کے ساتھ مختلف مذاہب کے ایمانیات پر کوئی کلام نہ کروں گا۔ آپ مذاہب کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح بعض مذاہب کے ایمانیات نے ان کے معتقدین کو دنیوی زندگی میں ترقی کرنے سے روکا ہے اور کس طرح مذاہب کے ایمانیات علم و عقل کی ترقی کا ساتھ نہیں دے سکے ہیں۔ پھر یہ بھی آپ دیکھیں گے کہ دوسری قوموں نے تنزل کی حالت میں اپنی مذہبی معتقدات پر ایمان رکھا اور ترقی کی حالت میں ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ایمان میں سب سے زیادہ مضبوط اس وقت تھے جب وہ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے، اور ان کے ایمان میں کمزوری آئی تو اس وقت جب کہ وہ عقل میں، علم میں، دنیوی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور دوسری قومیں ان پر غالب آ گئیں۔ آج مسلمان انتہائی تنزل کی حالت میں ہیں، اور اس کے ساتھ ضعف ایمانی کے مرض میں بھی شدت کے ساتھ مبتلا ہیں۔ اب سے ہزار بارہ سو برس پہلے وہ انتہائی ترقی کی حالت میں تھے، اور اس کے ساتھ اپنے مذہبی ایمان میں انتہا درجہ کے مضبوط بھی تھے۔ بخلاف اس کے یورپ کے مسیحی اور جاپان کے بودھی جب کہ مسیحی اور بودھی تھے تو حد درجہ تنزل کی حالت میں تھے، اور جب انہوں نے ترقی کی تو مسیحیت اور بودھیت پر ان کا ایمان نہ رہا۔ یہ اسلام کے ایمانیات اور دوسرے مذاہب کے

ایمانیات کا ایسا نمایاں فرق ہے جس کو بادی تامل ہر صاحب عقل و بصیرت انسان محسوس کر سکتا ہے۔

۲۔ دنیوی ایمان

اب دوسری طرف ان ایمانیات پر نظر ڈالیے جن کو ہم دنیوی ایمانیات سے تعبیر کر رہے ہیں۔ ان میں کوئی مذہبی عنصر شامل نہیں ہے۔ نہ یہاں کوئی خدا ہے، نہ کوئی مذہبی پیشوا، نہ کوئی الہامی کتاب، نہ کوئی ایسی تعلیم جو انسانی سیرت کو روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر تعمیر کرنے والی ہو۔ یہ خالص دنیوی امور ہیں۔

ان میں سب سے بڑی چیز ”قوم“ ہے جسے ایک خاص رقبے کے رہنے والے لوگ معبود بنا کر پورے خلوص و انہماک کے ساتھ پوجتے ہیں۔ تمام ”قوم پرست“ اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ قوم ان کی جان و مال کی مالک ہے، اس کی خدمت و حفاظت فرض ہے، اس کی خدمت میں جان دینا اور اس پر تن من دھن نثار کر دینا عین سعادت ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ انہی کی قوم برحق ہے، وہی زمین کی وارث اور مستحق ہے، دنیا کی تمام زمینیں اور دنیا کی ساری قومیں اس کے لیے غنائم اور سبا یا کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر شخص کا فرض ہے کہ سارے جہان میں اپنی قوم کا علم بلند کرے۔

دوسرا معبود ملک کا ”قانون“ ہے جس کو وہ خود بناتے ہیں اور پھر خود ہی اس کی عبادت کرتے ہیں۔ یہی عبادت ان کے اجتماعی ضبط و نظم کی ضامن ہے۔

تیسرا معبود ان کا اپنا ”نفس“ ہے جس کی پرورش، جس کی حاجات و ضروریات کی تکمیل، اور جس کے داعیات و خواہشات کی تحصیل ہر وقت ان کے پیش نظر رہتی ہے۔

چوتھا معبود ”علم و حکمت“ ہے جس پر وہ ایمان لائے
کی روشنی میں چلتے ہیں، اور جس کی رہنمائی میں ترقی کی راہ
ہوتے ہیں۔

یہ ایمانیات یقیناً دنیوی زندگی کے لئے ایک حد تک مفید
قطع نظر اس سے کہ حق اور صداقت کے اعتبار سے ان کا کیا
خالص دنیوی نقطہ نظر سے بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا فائدہ
نہ پائیدار۔ ان کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں کوئی
اخلاقی عنصر شامل نہیں ہوتا، اس لئے مذہب کا دامن ہاتھ
چھوٹتے ہی اخلاقی مفاسد کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قانون
نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں حاسہ اخلاقی پیدا کرے
میں اخلاق کا کوئی معیار قائم کر دے۔ نہ اس میں اتنی قوت
شخصی و اجتماعی زندگی میں اخلاق کی حفاظت کر سکے۔ اس کا
دائرہ عمل محدود ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ وہ قانون
خود بناتے ہیں اس معاملہ میں اور بھی زیادہ بے بس
اس لئے کہ ایسے قانون کی گرفت کو تنگ اور ڈھیلہ کرنا تو
اپنے اختیار میں ہے، جتنی جتنی آزادی عمل کی خواہش لوگوں
جاتی ہے، پرانی اخلاقی بندشیں تنگ اور ناقابل برداشت
لگتی ہیں۔ اور جب کسی اخلاقی بندش کے متعلق یہ احساس عام
ہے تو رائے عام کا دباؤ قانون کو اپنے بند ڈھیلے کرنے پر
ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اخلاق کے سارے بند کھل جاتے
عام اخلاقی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اور اخلاقی انحطاط
جس کے مہلک اثرات کو نہ دولت کی فراوانی روک سکتی ہے
کا زور، نہ مادی وسائل کی قوت، نہ علم و حکمت کی تدابیر۔

ہے جو اندر سے لگنا شروع ہوتا ہے اور مضبوط سے مضبوط عمارت کو اس کے ساز و سامان سمیت لے بیٹھتا ہے۔

اس کے علاوہ قوم پرستی اور نفس پرستی کے جو دوسرے مفاہیم ہیں وہ اتنے نمایاں ہیں کہ ان کے بیان میں کچھ زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں ہے۔ اب تو ان کو سمجھنے کے لئے کسی بحث و نظر کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ نظریات سے گزر کر محسوسات و مشاہدات کے درجہ میں آگئے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج انہی کی بدولت ایک بہت بڑی تہذیب ہلاکت و بربادی کے سرے پر پہنچ گئی ہے اور وہ انہی کے نتائج ہیں۔ جن کے یقینی ظہور کا اندیشہ آج تمام دنیا کو لرزہ بر اندام کیئے ہوئے ہے۔

چند اصولِ کلیہ

اس تمام بحث سے چند اصولِ کلیہ مستنبط ہوتے ہیں جن کو آئندہ مباحث کی طرف تجاوز کرنے سے پہلے ایک ترتیبِ صحیح کے ساتھ ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

۱۔ انسانی عمل کا منضبط اور منظم ہونا منحصر ہے اس پر کہ اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ کسی مستقل سیرت کے بغیر انسان کی عملی زندگی پراگندہ، متلون اور ناقابلِ وثوق رہتی ہے۔

۲۔ سیرت کی بنیاد اُن تصورات پر قائم ہوتی ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں، اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہیں کے زیرِ اثر رہ کر کام کرنے لگیں۔ اس رُسوخ کا اصطلاحی نام ”ایمان“ ہے اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو ہم ”ایمانیات“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۳۔ سیرت کی اچھی اور بُری، صحیح اور غلط، مضبوط اور کمزور تشکیل

کلیتہً انہی ”ایمانیت“ کی صحت اور ان کے رسوخ پر منحصر ہے۔ ایمان صحیح ہوں تو سیرت بھی صحیح ہوگی۔ ایمان مضبوط ہو تو سیرت مضبوط ہوگی۔ ورنہ معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔ لہذا انسان کی زندگی کو ایک صحیح اور اعلیٰ درجہ کے نظم میں لانے کے لئے ناگزیر ہے اس کی سیرت کو ایک صحیح اور مضبوط ایمان پر قائم کیا جائے۔
۴۔ جس طرح شخص واحد کے اعمال حیات کو پرانگی سے نکال کر ضبط اور نظم کے تحت لانے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے، اُسی طرح بہت سے اشخاص کو انتشار اور تفرقہ کی حالت سے نکال کر منظم اور متحد جمیعت بنادینے کے لئے ضروری ہے کہ ان سب دلوں میں ایک ہی مشترک ایمان بٹھا دیا جائے۔ پس تمدن کا مفاد کا مقتضی ہے کہ ایمان کا معاملہ محض شخصی نہ رہے بلکہ قومیت کا ارتداد بن جائے۔

۵۔ جب ایک مشترک ایمان کے زیر اثر بہت سے افراد میں مشترک قومی سیرت بن جاتی ہے اور اس سیرت کے اثر سے ان کی زندگی کے اعمال میں ایک طرح کی یک رنگی پیدا ہوتی ہے تو ایک خاص وازار کی تہذیب وجود میں آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر تہذیب تاسیس اور تشکیل میں ان ایمانیات کا بڑا دخل ہے جو قومی سیرت بناتے اور پختہ کرتے ہیں۔

۶۔ جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں، اور جس کے ایمان دنیوی امور پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی تہذیب اس کے مذہب جدا ہو جاتی ہے۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہتا۔

۷۔ تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخر کار اخلاقی انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

۸۔ تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو اذنی مدارج سے کر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقلی کا ساتھ دے سکیں اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی۔ بلکہ اس کی دنیا داری عین دینداری ہو اور دینداری عین دنیا داری۔

۹۔ جس قوم کا مذہب و تہذیب دونوں ایک ہوں اُس کا ایمان ترا مذہبی ایمان ہی نہیں ہوتا بلکہ بعینہ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے۔ اُس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں کے لئے غارت گر ہے، اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔

یہی وہ اصول کلیہ ہیں جن کے لحاظ سے ہم کو ایمان کے متعلق اس کے موقف پر تنقیدی نگاہ ڈالنی ہے۔

ایمان کی حقیقت، شخصی کردار میں اس کی بنیادی اہمیت، اور اجتماع تہذیب میں اس کی اساسی حیثیت کے بعد آپ دیکھئے کہ اسلام کن چیزوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے؟ اس کے ایمانیات عقائد تنقید کے معیار پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں؟ اس کے نظام ایمان کی حیثیت کیا ہے؟ اور انسان کے شخصی کردار اور اجتماعی سیر پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے؟

اسلام کے ایمانیات

قرآن مجید میں اسلام کے ایمانیات اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں کسی اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے مگر جن لوگوں نے قرآن کے اسلوب بیان کو نہیں سمجھا ہے، یا اس کے مضامین کا تتبع نہیں کیا ہے، ان کو چند در چند غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ کہیں وہ تمام ایمانیات کو یکجا بیان کرتا ہے، اور کہیں موقع و محل کے لحاظ سے بعض اجزاء یا صرف ایک جز بیان کر کے اسی پر زور دیتا ہے۔ اس سے بعض لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلام کے ایمانیات کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی ایک یا بعض پر ایمان لانا کافی ہے، اور "ض" کے انکار کرنے کے باوجود انسان فلاح پاسکتا ہے۔ حالانکہ قرآن کا ناطق فیصلہ یہ ہے کہ جتنے امور اس نے ایمانیات کے طور پر پیش کیے ہیں ان سب کو ماننا ضروری ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ سب مل کر ایک ناقابل تجزیہ و تحلیل کُل بناتے ہیں جس کو مِنْ حَدِثِ الْمَجْمُوع تسلیم کرنا چاہیئے۔ اگر ان میں سے ایک کا بھی انکار کیا گیا تو وہ باقی سب کے اقرار کو باطل کر دے گا۔ قرآن میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ

عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ (خم السجدہ - ۴)

اس آیت میں صرف خدا پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور اسی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا مشورہ سنایا گیا ہے۔

دوسری جگہ خدا کے ساتھ یوم آخر کا بھی ذکر ہے:-
 مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ
 أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ-۸)

یہی مضمون آل عمران (۱۲) مائدہ (۱۰) اور رعد (۳) میں بھی ہے۔
 تیسری جگہ خدا اور رسولوں پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔
 قَامِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ
 أَجْرٌ عَظِيمٌ۔ (آل عمران-۱۸)

یہی مضمون حدید (۲) میں بھی ہے۔
 ایک اور جگہ ایمان دار اس شخص کو کہا گیا ہے جو خدا اور محمد صلی اللہ
 علیہ وسلم پر ایمان لائے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ۔
 (النور-۹)

محمد (۲) جن (۲) اور الفتح (۲) میں اسی مضمون کا اعادہ ہے۔
 ایک جگہ خدا، کتب الہی، قرآن اور یوم آخر، چار چیزوں کا ذکر

ہے:-

وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ
 مِنْ قَبْلِكَ..... وَالْمُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
 الْآخِرِ۔ (النساء-۲۲)

ایک اور جگہ خدا، ملائکہ، انبیاء اور قرآن کے انکار کو کفر و فسق قرار
 دیا گیا ہے:-

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ
 وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ وَلَقَدْ
 أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا الْإِسْلَامُ

الْفَاسِقُونَ۔ (البقرہ-۱۲)

ایک جگہ اللہ، ملائکہ، کُتُبِ الہی، انبیاء اور قرآن پر ایمان لانیوالوں کو مومن کہا گیا ہے۔

”أَمَّنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ“
”كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ۔“

(البقرہ-۲۰)

دوسری جگہ ایمان کے پانچ اجزاء بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان باللہ، یومِ آخر و ملائکہ و کُتُبِ الہی و انبیاء۔

وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰئِكَتِ
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّينَ..... اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔ (البقرہ-۲۲)

سُورَةُ النِّسَاءِ میں مذکورہ بالا پانچ کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن پر بھی ایمان لانے کی تاکید کی گئی ہے اور ان کا انکار کرنے والوں کو کافر اور گمراہ قرار دیا گیا ہے (ملاحظہ ہو رکوع ۲۰)۔

ایک جگہ صرف یومِ آخر کے اقرار پر زور دیا گیا ہے اور اس کے انکار کو نامرادی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاءِ اللّٰهِ۔ (الانعام-۴)

اسی مضمون کا اعادہ اعراف (۱۷) یونس (۱) فرقان (۲) نمل (۱)

صافات (۱) میں ہے۔

دوسری جگہ یومِ آخر کے ساتھ کُتُبِ الہی کے انکار کو بھی عذاب الیم کا موجب قرار دیا گیا ہے۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا وَكَذَّبُوْا بِآيٰتِنَا

كَذَّابًا۔ (النبا۔ ۱)

تیسری جگہ یوم آخر اور کتب الہی کے ساتھ قرآن کو بھی ایمانیات میں شامل کیا گیا ہے۔

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ
مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ
هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

(البقرہ۔ ۱)

چوتھے مقام پر کہا گیا ہے کہ یوم آخر، کتب الہی اور انبیاء کے انکار سے تمام اعمال پر پانی پھر جاتا ہے۔ ایسا شخص دوزخی ہے اور اس کے عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ (الکہف ۱۲)

کتب الہی پر ایمان لانے کا اوپر بار بار ذکر آیا ہے اور ان میں تورات، انجیل، زبور اور صحف ابراہیمؑ کے نام تصریح کے ساتھ لائے گئے ہیں۔ مگر قرآن میں بیسیوں مقامات پر یہ بھی صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ان کتابوں کا ماننا ہرگز کافی نہیں ہے۔ ان کے ساتھ قرآن کا ماننا بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص تمام کتابوں کو ماننا ہو اور قرآن کو نہ ماننا ہو، تو وہ اسی طرح کافر ہے جس طرح تمام کتابوں کا انکار کرنے والا۔ ملاحظہ ہو بقرہ (۱۱-۱۲-۱۳-۱۴) نساء (۷) مائدہ (۲-۱۰) رعد (۳) عنکبوت (۵) زمر (۴) یہی نہیں بلکہ خدا کی بھیجی ہوئی ہر کتاب کو پورا پورا ماننا لازم ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی بعض باتوں کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے تو وہ بھی کافر ہے۔ (البقرہ۔ ۱۰)

اسی طرح انبیاء کے متعلق تصریح ہے کہ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے جن کے نام لائے گئے ہیں ان پر تفصیلاً اور جن کے نام نہیں ہیں ان پر اجمالاً۔ لیکن اگر کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان رکھتا ہو اور صرف

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر دے تو وہ یقیناً کافر ہے۔ قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات پر اس کی تصریح کی گئی ہے اور تمام انبیاء کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کو ایمان کی لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو بقرہ (۱۲) نساء (۲۳) مائدہ (۳-۱۱) انعام (۱۹) اعراف (۱۹-۲۰) انفال (۳) مؤمنون (۲) شوریٰ (۵) محمد (۱) طلاق (۲)۔ ان میں سے اکثر آیات ایسی ہیں جن میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی اُمتوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جب تک تم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لاؤ تم کو ہدایت نہیں مل سکتی۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ اسلام کے ایمانیات پانچ ہیں۔

۱۔ خدا۔

۲۔ ملائکہ۔

۳۔ کتب الہی، جن میں قرآن بھی شامل ہے۔

۴۔ انبیاء علیہم السلام، جن میں رسولِ عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں۔

۵۔ یومِ آخر یعنی قیامت۔

۱۔ اگرچہ حدیث میں ایک چھٹی چیز کا ذکر بھی آتا ہے، یعنی وَالْقَدَرِ الْخَيْرِ وَشَرِّهِ مِنَ اللَّهِ تَعَالٰی، لیکن دراصل یہ ایمان باللہ ہی کا ایک جز ہے اور قرآن میں اسی حیثیت سے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ حدیث میں اس کے علیحدہ ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایمان باللہ کا یہ جز اہم بھی ہے اور خفی بھی، اس لئے ذہن میں اس کو مستحضر رکھنے کی خاطر علیحدہ ذکر کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔

یہ اجمال ہے۔ آگے چل کر بتایا جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق تفصیلی عقیدہ کیا ہے؟ ان میں باہم کیا تعلق ہے جس کی وجہ سے ان کو الگ نہیں کیا جاسکتا اور ایک کے انکار سے سب کا انکار لازم آتا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کو ایمانیات میں داخل کرنے کا فائدہ کیا ہے؟

عقلی تنقید

یہ پانچوں ایمانیات امورِ غیب کے قبیل سے ہیں اور عالمِ آبرے گل سے ماوراء، اس لئے ہماری تقسیم کے مطابق یہ مذہبی و روحانی ایمانیات ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان پر اپنے روحانی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاقی و سیاسی اور تمدنی نظام کی بھی بنیاد رکھی ہے اس نے دین اور دنیا دونوں کو باہم ملا کر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے۔ جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں۔ اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تصرفات کے لئے جتنی طاقت کی ضرورت ہے وہ سب انہی پانچوں ایمانیات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے قوت کا ایک لامتناہی سرچشمہ ہیں جس کی رسد کبھی بند نہیں ہوتی۔ اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ جن ایمانیات سے اتنا بڑا کام لیا گیا ہے وہ عقلی حیثیت سے کیا پایہ رکھتے ہیں؟ اور ان میں ایک ایسے ہمہ گیر اور ترقی پذیر نظام کے لئے اساس اور منبع قوت بننے کی کہاں تک صلاحیت موجود ہے؟

اس سوال کی تحقیق میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہم کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہو۔ یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو، نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص

زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو، بلکہ تمام نوع انسانی کی فلاح اس کی مقصود ہو، اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام اجتماعی قائم ہو سکے جس میں ہر اُس چیز کو پرورش کیا جائے جو انسان کے لئے بحیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے، اور ہر اُس چیز کو مٹایا جائے جو اس کے لئے شر اور فساد ہے۔ ایسی ایک خالص انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جاسکتی جو عالم آب و گل سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ مادیات اور محسوسات دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں ہے، مثلاً سورج، چاند، زمین، ہوا، روشنی وغیرہ یا ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں نہیں ہے، مثلاً وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو ایمانیات بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، کیونکہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض بے معنی ہے، اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی صلاح میں کوئی اختیاری تاثیر رکھتے ہیں از روئے علم و عقل غلط ہے۔ علاوہ بریں ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع انسان کی روحانی اخلاقی اور عملی زندگی میں مترتب نہیں ہوتا۔ رہیں دوسری قسم کی چیزیں تو ظاہر ہے کہ وہ ایک مشترک انسانی تہذیب کے لئے اساس نہیں بن سکتیں، کیونکہ وہ بنائے تفریق و تقسیم ہیں نہ کہ بنائے جمع و تالیف۔ لہذا یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر رکھی جائے جو مادیات و محسوسات سے ماوراء ہوں۔

لیکن ان کا محض مادیات و محسوسات سے ماورا ہونا ہی کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان میں چند اور خصوصیات بھی پائی جائیں۔

۱۔ وہ خرافات اور اوہام نہ ہوں بلکہ ایسے اُمور ہوں جن کی تصدیق پر عقل سلیم مائل ہو سکتی ہو۔

۲۔ وہ دُور از کار باتیں نہ ہوں بلکہ ہماری زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہو۔

۳۔ ان میں ایسی معنوی قوت ہو جس سے تہذیب کا نظام انسان کے قوائے فکر و عمل پر تسلط کرنے میں پوری طرح مدد حاصل کر سکے۔

اس لحاظ سے جب ہم اسلام کے ایمانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں آزمائشوں میں پورے اُترتے ہیں۔

اولاً اسلام نے خدا، ملائکہ، وحی، رسالت اور یوم آخر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں کوئی استحالہ عقلی نہیں ہے۔ اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہو۔ نہ کوئی ایسی بات ہے جس کو ماننے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس کی کنہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ انکی حقیقتوں کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتی۔ لیکن ہمارے اہل علم و حکمت نے اب تک جتنے مُجَرَّدات و مُفَارِقَات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے تو انائی (انرجی)، حیات، جذب و کشش، نشو و ارتقاء اور ایسے ہی دوسرے اُمور کی تصدیق ہم نے اس بنا پر نہیں کی ہے کہ ہم ان کے حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں، بلکہ اس بنا پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجیہ و تعلیل کے لئے ہمارے نزدیک ان اُمور کا موجود ہونا ضروری ہے، اور ظواہر اشیاء کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کیے ہیں وہ ان اُمور کے موجود ہونے کا اقتضاء کرتے ہیں۔ پس اسلام جن مُجَرَّدات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لئے بھی یہ ضروری

نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے، بلکہ اس کے لئے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے وہ خلافت عقل نہیں ہے، اس کا صحیح ہونا اغلب ہے اور وہ ان پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے جو اسلام نے ایمانیات کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ
۱۔ کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے۔

۲۔ اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس کے احکام کے مطابق اس وسیع کائنات کی تدبیر کر رہی ہیں۔
۳۔ انسان کے وجود میں اس کے خالق نے خیر اور شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی، علم اور جہل دونوں کا اسکے اندر اجتماع ہے۔ غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان متضاد قوتوں اور متخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے اس کی پیروی انسان کرنے لگتا ہے۔

۴۔ اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس کا خالق خود بنی نوع انسان ہی میں سے ایک بہتر آدمی کو انتخاب کرتا ہے اور اس کو علم صحیح عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کر دیتا ہے۔

۵۔ انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لئے اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ ایک دن اس کو ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا۔ اور اپنے اعمال کے

اچھے یا بُرے نتائج دیکھنے ہوں گے۔

یہ نظریہ خدا، ملائکہ، وحی، رسالت اور یوم آخر پانچوں اُمور کے وجود کا مقتضی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلاً محال ہو۔ نہ اس کی کسی چیز کو وہمیات و خرافات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ برعکس اس کے ہم اس پر جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں اُسی قدر اس کی تصدیق کی جانب ہمارا میلان بڑھتا جاتا ہے۔

خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے، مگر اس کا وجود تسلیم کیئے بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا معنہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔

ملائکہ کے وجود کی کیفیت ہم متعین نہیں کر سکتے مگر ان کے نفس وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کو ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اُس نام سے یاد نہیں کرتے جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔

قیامت کا آنا اور ایک نہ ایک دن دُنیا کے نظام کا دور ہم برہم ہو جانا عقلی قیاسات کی رو سے اغلب بلکہ قریب یہ یقین ہے۔

انسان کا اپنے خدا کے آگے جوابدہ ہونا اور اپنے اعمال کے لئے مستوجب جزا و سزا ہونا کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں کیا جاسکتا، مگر عقل سلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے متعلق جتنے نظریے قائم کیئے گئے ہیں ان میں سے سب سے زیادہ بہتر، نتیجہ خیز، اور اقرب الی القیاس نظریہ یہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

رہا وحی اور رسالت کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی سائنٹفک ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا۔ مگر جن کتابوں کو وحی الہی کی حیثیت سے

پیش کیا گیا ہے اُن کے معافی، اور جن لوگوں کو خدا کا رسول کہا گیا ہے اُن کی سیرتوں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نوع انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے برابر گہرے، وسیع پائیدار اور مفید اثرات کسی رہنما نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ معمولی انسانی لیڈروں کو۔

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے ایمان پر عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ عقل کے پاس ان کی تکذیب کے لئے کسی قسم کا مواد نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقاء کے کسی مرتبہ پر پہنچ کر انسان ان کو رد کر دینے پر مجبور ہو جائے۔ بلکہ اس کے برعکس عقل ان کی اعلیٰیت کا حکم لگاتی ہے۔ ایمان اور تصدیق کا معاملہ، تو اس کا تعلق عقل سے نہیں ہے، وجدان اور ضمیر سے ہے۔ ہم جتنے مجتہدات اور غیبیات کو مانتے ہیں، ان سب کی تصدیق دراصل ہمارے وجدان پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی امر غیبی کو ہم نہ مانتا چاہیں، یا ہمارا دل اس پر نہ ٹھکتا ہو، تو کسی عقلی دلیل سے ہم کو اس کی تصدیق پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر ایتھر کے وجود پر جتنے دلائل قائم کیئے گئے ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو یقینی طور پر اس کو ثابت کر دیتا ہو اور اس کی صحت میں شک کی گنجائش نہ چھوڑتا ہو۔ انہی دلائل کو دیکھ کر بعض اہل حکمت اس پر ایمان لے آتے ہیں، اور انہی کو بعض دوسرے حکماء نا کافی سمجھ کر ایمان لانے سے انکار کر دیتے ہیں۔ پس تصدیق و ایمان کا انحصار دراصل ضمیر کے اطمینان اور وجدان کی گواہی پر ہے۔ البتہ عقل کا اس میں اتنا دخل ضرور ہے کہ جن کی تصدیق عقل کے خلاف ہوتی ہے ان کے بارے

میں وجدان اور عقل کے درمیان کشمکش برپا ہوتی ہے اور ایمان ضعیف ہو جاتا ہے۔ اور جن کی تصدیق قیاس عقلی کے خلاف نہیں ہوتی جن کی تصدیق میں عقل بھی ایک حد تک مددگار ہوتی ہے، ان کے بارے میں ضمیر کا اطمینان زیادہ بڑھ جاتا ہے اور اس سے ایمان کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

ثانیاً غیبیات میں سے بیشتر ایسے امور ہیں جن کی حیثیت محض علمی ہے یعنی ان سے ہماری عملی زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایٹھر (ETHER) ہیوٹی، صورتِ مطلقہ، مادہ، فطرت و قانونِ فطرت، قانونِ علت و معلول، اور ایسے ہی بیسیوں علمی مسلمات یا مفروضات کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے کا ہماری زندگی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اسلام نے جن امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت محض علمی ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اخلاقی اور عملی زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ ان کی تصدیق اصلُ الاصول قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض علمی صداقتیں نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح علم اور ان پر کامل ایمان ہمارے نفسانی اوصاف، خصائص پر، ہمارے شخصی اعمال پر، اور ہمارے اجتماعی معاملات، شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان آگے آئے گا۔

ثالثاً اسلام کے نظام تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب والی وسیع انسانی آبادیوں پر ان کی زندگی کے محفی اور جزئی سے جزئی شعبوں تک میں اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف انہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ یقین ایک سمیع و بصیر، قاہر و غالب، اور رؤوف و رحیم خدا ہمارے اوپر حکم

ہے، اس کے بے شمار لشکر ہر جگہ ہر آن موجود ہیں، پیغمبر اسی کا بھیجا ہوا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیئے ہیں وہ اس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں، اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا بُرا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑے گا، اپنے اندر وہ زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ مادی طاقتیں صرف جسم کو جکڑ سکتی ہیں۔ تربیت اور تعلیم کے اخلاقی اثرات انسانی سوسائٹی کے اعلیٰ طبقوں تک پہنچ سکتے ہیں صرف وہاں کام کر سکتا ہے جہاں اسکے کارندوں کی پہنچ ہو۔ مگر یہ قوت ہے جو دل اور رُوح پر قبضہ کرتی ہے۔ عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش، سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ جنگل کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا، حتیٰ کہ اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا وہاں خدا کے حاضر و ناظر ہونیکا یقین، پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی باز پرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے جو نہ کوئی پولیس کا سپاہی کر سکتا ہے، نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم۔ پھر جس طرح اس یقین نے معمورۂ ارضی پر پھیلے ہوئے بیشمار مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا، ان کو ملا کر ایک قوم بنایا، ان کے تخیلات، اعمال اور اطوار میں غایت درجہ کی یک جہتی پیدا کی، ان کے اندر اختلاف ظروف و احوال کے باوجود ایک تہذیب پھیلائی اور ان میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے فدا کاری کی والہانہ رُوح پھونکی، اس کی مثال کہیں ڈھونڈنے نہیں مل سکتی۔

یہاں تک جو کچھ ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح

میں ایمان سے مراد اللہ، ملائکہ، کتب، رُسل اور یومِ آخر پر ایمان لانا ہے اور یہ پانچوں ایمانیات مل کر ایک ناقابلِ تجزیہ کل بناتے ہیں، یعنی ان کے درمیان ایسا ربط ہے کہ اگر ان میں سے کسی ایک جز کا بھی انکار کیا جائے تو اُس سے کل کا انکار لازم آتا ہے۔ پھر عقلی تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جس قسم کی تہذیب قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے صرف یہی اُمور ایمانیات بن سکتے ہیں اور انہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو۔

اب ہمیں تیسرے سوال کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور وہ یہ ہے کہ اسلام میں ایمان کی کیا حیثیت ہے؟ اور یہ حیثیت کیوں ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے میں لوگوں نے بکثرت غلطیاں کی ہیں، اور بعض مشہور اہل علم و فضل اصحاب بھی اس میں ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ اس لئے اسکو ذرا بسط کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

اسلام میں ایمان کی اہمیت

اگر سوال کیا جائے کہ قرآن مجید کی دعوت کا اصلُ الاصول کیا ہے تو اس کا جواب صرف ایک لفظ میں دیا جاسکتا ہے، اور وہ ”ایمان“ ہے۔ قرآن کے نزول اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کا مقصد ہی ایمان کی طرف دعوت دینا ہے۔

(قرآن اپنے لانے والے کے متعلق صاف کہتا ہے کہ وہ ایمان کا منادی ہے۔ مَا تَبْنَا اِنَّا سَمِعْنَا مَنَادًا دِيًّا يِّنَادِي لِلْاِيْمَانِ۔ (آل عمران۔ ۲۰))

اور خود اپنے متعلق اعلان کرتا ہے کہ (وہ صرف ان لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھائے گا جو غیب کی

باتوں (یعنی انہی ہدایات) پر یقین لانے کے لئے تیار ہوں۔ ہُدای
لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (البقرہ-۱)

وہ وعظ سے، تلقین سے، وعدہ و وعید سے، بحث و استدلال
سے، قصص و حکایات سے اسی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ انسان سے
اس کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اس کے بعد وہ تزکیہ
نفس، اصلاح اخلاق اور وضع قوانین مدنی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔
اس کے نزدیک ایمان ہی حق، صدق، علم، ہدٰی اور نور ہے۔ اور عدم
ایمان، یعنی کفر وہ جہل، ظلم، باطل، کذب، ظلمت اور ضلالت قرار
دیتا ہے۔

قرآن حکیم نے ایک واضح خط فاصل کھینچ کر تمام دُنیا کے انسانوں کو
دو گروہوں پر تقسیم کر دیا ہے۔ ایک گروہ ایمان لانے والوں کا۔ دوسرا
گروہ انکار کرنے والوں کا۔ پہلا گروہ اس کے نزدیک حق پر ہے، علم
اور نور سے بہرہ ور ہے، اس کے لئے ہدایت کا راستہ اور تقویٰ و
پرہیزگاری کا دروازہ کھل گیا ہے، اور وہی فلاح پانے والا ہے۔
دوسرا گروہ اس کے نزدیک کافر ہے، ظالم ہے، جاہل ہے، تاریکی میں
بہنسا ہوا ہے، ہدایت کی راہیں اس کے لئے بند ہیں، تقویٰ اور
پرہیزگاری میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اور اس پر خسران و نامرادی کا
فیصلہ ہو چکا ہے۔

(وہ ان دونوں طبقوں کی مثال اس طرح دیتا ہے کہ ان میں سے
ایک اندھا اور بہرا ہے اور دوسرا دیکھنے اور سننے والا۔ مَثَلُ الْفَرِيقَيْنِ
كَالْأَعْمٰی وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ۔ (ہود-۲)
(وہ کہتا ہے کہ ایمان کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي
إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (الشوریٰ-۵))

(اور اس کے سوا جتنے راستے ہیں سب کا چھوڑ دینا ضروری ہے
وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ - (الانعام)
- (۱۹)

اس نے بلا کسی لاگ لپیٹ کے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ جو اللہ
اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کو ماننا ہے اس کے پاس ایک روشن
چراغ ہے جس کی مدد سے وہ سیدھے رستے پر چل سکتا ہے۔ اس چراغ
کی موجودگی میں اس کے لئے بھٹک جانے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ وہ
راہِ راست کو ٹیڑھے راستوں سے ممتاز کر کے دیکھ لے گا، اور بخیر و عافیت
فلاح کی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور جو ایمان کی شمع نہیں رکھتا۔
اس کے پاس کوئی روشنی نہیں ہے۔ اس کے لئے سیدھے اور ٹیڑھے
راستوں کا فرق معلوم کرنا مشکل ہے۔ وہ اندھوں کی طرح اندھیرے
میں اُٹکل سے ٹٹول ٹٹول کر چلے گا۔ ممکن ہے کہ اتفاقاً اس کا کوئی قدم
سیدھے راستہ پر بھی پڑ جائے، مگر یہ راہِ راست پر چلنے کا کوئی یقینی
ذریعہ نہیں ہے۔ غالب امکان اسی کا ہے کہ راہِ راست سے ہٹ
جائے گا، کہیں خندق میں گرے گا اور کہیں کانٹوں میں جا پھنسنے لگا۔
پہلے گروہ کے متعلق اس کا قول ہے کہ۔

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا
النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

(الاعراف - ۱۹)

”پس جو لوگ رسول پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی مدد و
حمایت کی اور اس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے۔ وہی
در اصل فلاح پانے والے ہیں۔“

اور:-

اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ
رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
(الحديد-۳)

”لوگو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اللہ تم کو
اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا اور تمہارے لیے ایسی روشنی کرے
گا جس میں تم چلو گے، اور تم کو بخش دے گا۔“
اور دوسرے گروہ کے متعلق کہتا ہے:-

وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ
إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ
(یونس-۷)

”جو لوگ خدا کے سوا دوسرے شرکا کو پکارتے ہیں جانتے
ہو وہ کس کی پیروی کرتے ہیں؟ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے اور
محض اُنکی چلتے ہیں۔“

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ
الْحَقِّ شَيْئًا۔ (النجم-۲)

”وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور گمان کا حال یہ ہے
کہ وہ حق کی ضرورت سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔“

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى
مِّنَ اللَّهِ، إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ
(القصاص-۵)

”اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہو گا جس نے اللہ کی ہدایت
کے بغیر اپنے نفس کی خواہش کی پیروی کی؟ اللہ ایسے ظالموں کو کبھی
سیدھا راستہ نہیں دکھاتا۔“

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَبَالِدًا مِّنْ نُورٍ۔

(النور۔ ۵)

”اور جس کو اللہ نے روشنی نہ دی ہو اس کے لئے پھر کوئی

روشنی نہیں۔“

اس پورے مضمون کی تصریح سورہ بقرہ میں ملتی ہے جس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ایمان اور کفر کے فرق سے نوع بشری کے ان دونوں گروہوں میں کتنا عظیم فرق ہو جاتا ہے۔

لَا أَلْزَامَ فِي الدِّينِ، قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِّنَ
الْغَيِّ، فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ
اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۚ اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُم
مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ
الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُم مِّنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ،
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔

(البقرہ۔ ۲۴)

”دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت کا راستہ گمراہی سے
الگ کر کے دکھا دیا گیا ہے۔ اب جو طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے
آیا اس نے ایک مضبوط رسی تمام لی جو ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اور
اللہ سب کچھ سننے اور جانتے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے
جو ایمان لائے۔ وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو
کافر ہیں ان کے مددگار شیطان ہیں۔ وہ ان کو نور سے تاریکیوں کی طرف
لے جاتے ہیں۔ وہ دوزخی ہیں اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں
گے۔“

عمل پر ایمان کا تقدم

پھر اسی ایمان اور کفر کے بنیادی فرق نے انسانی اعمال کے درمیان بھی فرق کر دیا ہے۔ قرآن کے نزدیک نیکوکار اور پرہیزگار وہی شخص ہو سکتا ہے جو ایمان لائے۔ ایہ ان کے بغیر کسی عمل پر بھی تقویٰ اور صلاح کا اطلاق نہیں ہوتا، خواہ اہل دنیا کی نگاہ میں وہ عمل کتنا ہی نیک ہو۔ وہ کہتا ہے:-

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْمُتَّقُونَ۔ (الزمر-۴)

”اور جو شخص سچی بات لے کر آیا، اور جس نے اس کی تصدیق کی،
بس وہی لوگ متقی ہیں۔“

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ
وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ۔ وَالَّذِينَ
يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِنْ قَبْلِكَ
وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ (البقرہ-۱)

”قرآن ہدایت دیتا ہے متقین کے لیے جو غیب کی باتوں پر ایمان
لائے ہیں، نماز قائم کرتے اور ہمارے بخشے ہوئے مال کو خرچ کرتے
ہیں، اور جو اُس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تیرے اوپر اتاری گئی ہے
اور اُن کتابوں پر بھی جو تجھ سے پہلے نازل کی جا چکی ہیں، اور جو آخرت
پر یقین رکھتے ہیں۔“

پس قرآن کی نگاہ میں ایمان ہی تقویٰ کی جڑ اور پرہیزگاری کی اصل
ہے۔ جو شخص ایمان لاتا ہے اس کے نیک اعمال اس طرح پھلتے اور
پھولتے ہیں جس طرح ابھی زمین، اور ابھی آب و ہوا میں باغبان کے
لگائے ہوئے درخت سرسبز ہوتے اور پھل پھول لاتے ہیں۔ بخلاف۔

اس کے جو شخص ایمان کے بغیر عمل کرتا ہے وہ گویا ایک بنجر، پتھر لی زمین اور خراب آب و ہوا میں باغ لگاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ ایمان کو عمل صالح پر مقدم رکھا گیا ہے، اور کہیں بھی نیرے حسن عمل کو، ایمان کے بغیر، نجات اور فلاح کا ذریعہ قرار نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ اگر آپ قرآن کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے جس قدر اخلاقی ہدایات اور قانونی احکام دیئے ہیں ان سب کے مخاطب صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اس قسم کی تمام آیات یا تو یَاٰیہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے شروع ہوتی ہیں، یا اثنائے بیان میں کسی نہ کسی طرح سے تصریح کر دی گئی ہے کہ خطاب صرف مومنین سے ہے۔ باقی رہے کفار تو ان کو حسن عمل کی نہیں، صرف ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ مومن نہیں ان کے اعمال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، وہ بے وزن ہیں، بے حقیقت ہیں اور قطعاً ضائع ہو جانے والے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَعْمَالُہُمْ کَسْرًاۤیۡ بِقِیَعَتٍ
یَّحْسَبُ الظَّالِمَانُ مَآءً حَتّٰی اِذَا جَآءَہُمْ لَمُیۡجٌۭ کَآۤثِرٌ
شَیًۡٔا۔ (النور۔ ۵)

”اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے چٹیل میدان میں سراب۔ پیاسا دور سے دیکھ کر سمجھتا ہے کہ پانی ہے مگر

۱۔ یہ مضمون قریب قریب اسی تمثیل کے ساتھ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے، ملاحظہ ہو سورۃ بقرہ، رکوع ۳۶۔

۲۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو البقرہ (۳-۹-۳۸) النساء (۲۴) المائدہ (۲) ہود (۲) التعل (۱۳) طہ (۳-۶) الیقین۔ العصر۔

جب وہاں پہنچتا ہے تو کچھ نہیں پاتا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعِيَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَزَنًا ۝ ذَٰلِكَ جزاؤهم جهنم بما كفروا واتخذوا آيَتِي ورسلي هزوا ۝ (البقرہ-۱۲)

”ان سے کہو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے کون لوگ سب سے زیادہ نامراد ہیں؟ وہ جن کی کوششیں دنیوی زندگی میں بے کار صرف ہو گئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ ہم بہت اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار کیا اور یہ تسلیم نہ کیا کہ انہیں اس کے پاس حاضر ہونا ہے۔ اس وجہ سے ان کے اعمال اکارت گئے۔ قیامت کے دن ہم ان کے اعمال کو کوئی وزن نہ دیں گے اور وہ دوزخ میں جائیں گے۔ یہ بدلہ ہے اس کا کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے رسولوں کو مضحکہ بنالیا۔“

یہی مضمون سورہ مائدہ (رکوع ۱) انعام (۱۰) اعراف (۱۷) توبہ (۳) ہود (۲) الزاب (۲) زمر (۷) محمد (۱) میں بیان ہوا ہے، اور سورہ توبہ میں صاف تصریح کی گئی ہے کہ جو کافر بظاہر نیک عمل کرتا ہے وہ مومن کے برابر کبھی نہیں ہو سکتا۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، لَا يَسْتَوُونَ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَكْثَرُ دَرَجَةً
عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ۔ (التوبہ - ۳)

”کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے والے اور مسجد حرام کو آباد
رکھنے والے کا مرتبہ اس شخص کے برابر سمجھ لیا ہے جو اللہ اور یوم آخر
پر ایمان لایا اور جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا؟ یہ دونوں اللہ کے
نزدیک ہرگز برابر نہیں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو لوگ
ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جان اور مال
سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک بڑے درجہ والے ہیں اور وہی
کامیاب ہیں۔“

خلاصہ

اس بیان سے اور قرآن مجید کی اُن آیات سے جو اس کی تائید
میں پیش کی گئی ہیں۔ چند امور غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوتے ہیں۔
۱۔ ایمان، نظام اسلامی کا سنگِ بنیاد ہے۔ اسی پر اس نظام کی
عمارت قائم کی گئی ہے۔ اور کفر و اسلام کا امتیاز صرف ایمان و عدم
ایمان کے بنیادی فرق پر مبنی ہے۔

۲۔ انسان سے اسلام کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اس
مطالبہ کو قبول کرنے والا دائرۃ اسلام میں داخل ہے، اور تمام اخلاقی
احکام اور مدنی قوانین اسی کے لئے ہیں۔ اور جو اس مطالبہ کو رد کرے
وہ دائرۃ اسلام سے خارج ہے، اس سے نہ کوئی اخلاقی حکم متعلق ہوتا
ہے اور نہ کوئی مدنی قانون۔

۳۔ اسلام کے نزدیک ایمان ہی عمل کی جڑ ہے۔ صرف وہی عمل
اس کی نگاہ میں قدر و قیمت اور وزن رکھتا ہے جو ایمان کی بنیاد پر ہو۔

اور جہاں سرے سے یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو وہاں تمام اعمال بے اصل اور بے وزن ہیں۔

ایک اعتراض

ایمان کی یہ اہمیت بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ چند عقلی نظریات کا ماننا کوئی ایسی جوہریت نہیں رکھتا کہ اس کی بنیاد پر نوع انسانی کو دو گروہوں پر تقسیم کیا جاسکے۔ ہمارے نزدیک اصل چیز اخلاق، سیرت اور کردار ہے۔ اسی پر اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط کا امتیاز قائم ہے۔ جو شخص عمدہ اخلاق، پاک سیرت اور نیک کردار رکھتا ہو وہ خواہ اُن نظریات کو جنہیں اسلام نے ایمانیات قرار دیا ہے تسلیم کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، بہر حال ہم اس کو نیک کہیں گے اور متقین کے گروہ میں شمار کریں گے۔ اور جس میں یہ صفات نہیں ہیں اس کے لئے ایمان اور کفر کا اعتقادی فرق بالکل بے اصل ہے۔ وہ خواہ کسی عقیدہ کا قائل ہو، ہم اس کو بُرا ہی کہیں گے۔ رہی یہ بات کہ اعمال کے وزن اور ان کی قدر و قیمت کا انحصار ایمان پر ہے، اور یہ کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل صالح نہیں ہو سکتا، تو یہ محلِ نظر ہے۔ کسی دلیل عقلی کے بغیر یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی کہ محض خدا، یا رسول، یا کتاب، یا قیامت کے متعلق اسلام سے مختلف عقیدہ رکھنے والے کے فضائل اخلاق اور اعمالِ حسنہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر اسلام کسی عقیدہ کو صحیح سمجھتا ہے تو وہ بلاشبہ اس کی تبلیغ کا حق رکھتا ہے، لوگوں کو اس کی طرف بلا سکتا ہے، اس پر ایمان لانے کی دعوت دے سکتا ہے۔ مگر اعتقاد کے سوال کو اخلاق اور اعمال کے حدود پر وسیع کرنا اور اخلاق کی فضیلت، سیرت کی پاکیزگی، اعمال کی بہتری کو ایمان پر منحصر کر دینا کہاں تک درست ہے؟

نظاہر یہ اعتراض اتنا وزنی ہے کہ بعض مسلمان بھی اس سے متاثر

ہو کر اسلام کے اصول میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ مگر ایمان کی حقیقت اور سیرت و کردار سے اس کے تعلق کو سمجھ لینے کے بعد یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔

اعتراض کی تحقیق

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ افراد نوع بشری کے درمیان خوب و زشت کا امتیاز دراصل دو جدا گانہ بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک پیدائشی سرشت جس کا حسن و قبح انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ دوسرے اکتساب جس کا نیک یا بد ہونا عقل و فکر اور اختیار و ارادہ کے صحیح یا غلط استعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ دونوں امور انسانی زندگی میں اپنی تاثیرات کے لحاظ سے باہم اس قدر خلط ملط ہیں کہ ہم ان کو اور ان کی تاثیرات کے حدود کو ایک دوسرے سے ممتاز نہیں کر سکتے۔ مگر نظری حیثیت سے اتنا ضرور جانتے ہیں کہ انسان کی حیاست فکر و عمل میں حسن و قبح کی یہ دونوں بنیادیں الگ الگ موجود ہیں۔ جو حسن و قبح سرشت کی بنیاد پر ہے وہ اپنی اصل کے لحاظ سے میزان عدل میں کسی وزن کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ وزن صرف اُس حسن و قبح کو حاصل ہونا چاہیے جو اکتساب کی بنیاد پر ہو۔ تعلیم، تلقین، تہذیب کے لیے جتنی

۱۔ ٹھیک یہی بات ہے جو قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ۔ ۲۸) یعنی ”اللہ کسی سے متنفس کو اس کی قدرت سے زیادہ کسی شے کا مکلف نہیں قرار دیتا۔ اُس نے جو کچھ کسب کیا ہے اسی کا فائدہ اُس کو ملے گا اور اُس نے جو کچھ اکتساب کیا ہے اسی کی ذمہ داری اُس پر ہوگی۔“ رہی پیدائشی سرشت تو اللہ نے جس کو جیسی چاہی سرشت بخشی۔ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲ پر)

کوششیں کی جاتی ہیں ان سب کا تعلق پہلی بنیاد (یعنی پیدائشی سرشت) سے نہیں ہے، کیونکہ اس کے حُسن کو قبح سے یا قبح کو حُسن سے بدلتا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کا تعلق دوسری بنیاد (اکتساب سے ہے جسکی رہنمائی صحیح تعلیم، اور صحیح تربیت کے ذریعہ سے حُسن کی جانب اور غلط تعلیم اور غلط تربیت کے ذریعہ سے قبح کی جانب کی جاسکتی ہے۔

اس اصل کے لحاظ سے جو شخص انسان کی اکتسابی قوتوں کو حُسن کے طرف پھیرتا اور اسی راہ میں ترقی دینا چاہتا ہو اس کے لئے صحیح طریقہ کا کیا ہو سکتا ہے؟ یہی کہ انسان کو علم صحیح بخشے، اور اسی علم کی روشنی میں اس کے لئے ایک ایسا نظام تربیت وضع کرے جو اس کے اخلاق، سیرت اور کردار کو، جہاں تک اس کا تعلق اکتساب سے ہے نہ کہ سرشت سے، ایک بہتر سانچے میں ڈھال سکتا ہو۔ اس باب میں علم کا تربیت پر مقدم ہونا لازمی ہے، اور کوئی صاحب عقل و دانش اس تقدم سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ علم ہی عمل کی بنیاد ہے۔ علم صحیح کے بغیر کسی عمل کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے۔

اب علم کو لیجئے۔ علم کی ایک قسم تو وہ ہے جس کا تعلق ہماری زندگی کے جزئیات سے ہے، جس کو ہم مدرسوں میں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور جو بے شمار علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو علم کلی، اور قرآن کی اصطلاح میں ”العلم“ کے نام سے موسوم ہے۔ جس کا تعلق ہمارے معاملات سے نہیں بلکہ ”ہم“ سے ہے۔ جو اس سے بحث کرتا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱ کا) یَشَاءُ (آل عمران ۱) اور انسان کی زندگی میں اس کی سرشت اور اس کے اکتساب کا جتنا حصہ ہے اس کو خدا خوب جانتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْہِ شَیْءٌ۔ (آل عمران ۱)

ہے کہ ہم کیا ہیں؟ یہ دُنیا جس میں ہم رہتے سہتے ہیں اس میں ہماری
 حیثیت کیا ہے؟ ہم کو اور اس دُنیا کو کس نے بنایا ہے؟ اس بنانے والے
 سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ ہمارے لئے زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ
 رہدہی اور صراطِ مستقیم کیا ہے اور وہ ہمیں کیونکر معلوم ہو؟ ہمارے
 سفرِ حیات کی منزل مقصود کون سی ہے؟ علم کی ان دونوں قسموں میں سے
 بھی دوسری قسم اصل اور بنیاد کا حکم رکھتی ہے۔ ہمارے تمام جزئی علوم
 اس کی فرع ہیں اور اسی علم کے صحیح یا غلط ہونے پر ہمارے تمام
 تخیلات اور معاملات کی صحت یا غلطی کا دار و مدار ہے۔ پس انسان کی
 تربیت و تہذیب کے لئے جو نظام بھی وضع کیا جائے گا۔ اس کی بنیاد
 اسی علم کئی پر قائم ہوگی۔ اگر علم کئی صحیح ہوگا تو تہذیب و تربیت کا نظام
 بھی صحیح ہوگا۔ اور اگر اس علم میں کوئی خرابی ہوگی تو لازماً اس خرابی سے
 تہذیب و تربیت کا نظام بھی خراب ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں خدا، ملائکہ، کتب، رُسل اور یومِ آخر کے متعلق جو
 معتقدات پیش کئے گئے۔ وہ اسی علم کئی سے متعلق ہیں، اور ان
 پر ایمان لانے کا مطالبہ اس قدر شدت سے اسی لئے کیا گیا ہے کہ
 اسلام کا نظامِ تہذیب و تربیت اسی علم پر مبنی ہے۔ اسلام کے نزدیک
 انسان کی اکتسابی قوتوں کی تربیت اور تہذیب کا وہی نظام صحیح ہے جو
 صحیح علم کئی پر قائم ہو۔ کسی علم کئی کے بغیر جو نظام قائم کئے گئے ہیں، یا
 جن کی بنیادیں صحیح علم پر نہیں رکھی گئی ہیں، وہ اصلاً غلط ہیں۔ ان کے تحت
 انسان کی اکتسابی قوتیں غلط راستوں پر ڈال دی گئی ہیں۔ ان راستوں
 میں انسان کی جو مساعی صرف ہوتی ہیں وہ بظاہر کتنی ہی صحیح معلوم ہوتی
 ہوں، مگر حقیقت کے اعتبار سے ان کا مصرف غلط ہے۔ ان کا رخ صحیح
 منزل مقصود کی جانب نہیں ہے۔ وہ کامیابی کے مقام تک نہیں پہنچ

سکتیں۔ اس لئے وہ ضائع ہو جانے والی ہیں اور ان کا کوئی فائدہ انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام صرف اپنے راستے کو ”صراطِ مستقیم“ کہتا ہے اور باقی تمام راستوں کو جو بلا علم یا غلط علم کی بنا پر اختیار کیے گئے ہیں، چھوڑ دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ۔ (الانعام - ۱۶)

اور اسی لئے اسلام کہتا ہے کہ جس کا ایمان صحیح نہیں ہے اس کے تمام اعمال بے نتیجہ ہیں اور وہ آخر کار تار مار رہنے والا ہے۔

وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي

الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔ (المائدہ - ۱)

اسلام نے جو ایمانیات پیش کئے ہیں وہی اس کے نزدیک عین علم، عین حق، عین صدق، عین ہدایت اور عین نور ہیں۔ اور جب وہ ایسے ہیں تو لازماً ان کے خلاف جتنے معتقدات ہیں وہ عین جہل، عین باطل، عین کذب، عین ضلالت، اور عین ظلمت ہونے چاہئیں۔ اگر اسلام ان کو چھوڑ دیتے کا مطالبہ اس قدر شدت کے ساتھ نہ کرتا، اور اگر وہ ان غلط معتقدات کے قائلین کو صحیح ایمان رکھنے والوں کے برابر درجہ دیتا تو گویا وہ اس امر کا اقرار کرتا کہ اس کے ایمانیات عین حق نہیں ہیں، اور اس کو ان کے صدق اور ہدایت اور نور ہونے کا خود ہی پورا یقین نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا ان ایمانیات کو پیش کرنا، اور ان کی بنا پر تربیت و تہذیب کا ایک نظام وضع کرنا، اور اس نظام میں شامل ہونے کے لئے لوگوں کو دعوت دینا، سب بے معنی ہوتا۔ اس لئے کہ اگر وہ یہ تسلیم کر لیتا کہ اس علم کئی کے خلاف دوسرے علوم بھی اسی کی طرح صحیح ہیں، یا سب سے کسی علم کئی کے مفقود ہونے میں بھی کوئی مضائقہ

نہیں ہے، تو اس علم کَلّی کو پیش کرنے اور اس پر ایمان لانے کی دعوت دینے میں کوئی معنویت باقی نہ رہتی۔ اسی طرح اگر وہ یہ مان لیتا کہ اس علم کے خلاف دوسرے علوم کی بنیاد پر، یا کسی علم کَلّی کے بغیر، تہذیب و تربیت کے جو نظام وضع کیئے گئے ہیں اُن کے ذریعہ سے بھی انسان فلاح پاسکتا ہے، تو پھر نظام اسلامی کے اتباع کی طرف دعوت دینے میں کوئی وزن نہ رہتا۔

علاوہ بریں اگر وہ بحث آپ کے ذہن میں تازہ ہے۔ جو پچھلے صفحات میں ایمان کی حقیقت پر کی گئی ہے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام نے ایمان پر اس قدر زور کیوں دیا ہے؟ تخیل کی دُنیا میں رہنے والے ہریت پر، پانی پر، بلکہ ہوا پر بھی قصر تعمیر کر سکتے ہیں مگر اسلام ایک حکیمانہ مذاہب ہے۔ وہ تہذیب و تربیت کی عمارت بودی بنیادوں پر تعمیر نہیں کر سکتا۔ وہ سب سے پہلے انسان کی رُوح اور اس کے قوائے فکری کی گہرائیوں میں مضبوط بنیادیں قائم کرتا ہے، پھر ان پر ایک ایسی عمارت بناتا ہے جو کسی کے ہلائے نہیں مل سکتی۔ وہ سب سے پہلے انسان کے ذہن نشین کرتا ہے کہ تیرے اُوپر ایک خدا ہے جو دُنیا اور آخرت دونوں میں تیرا حاکم ہے۔ جس کی حکومت سے تو کسی طرح نہیں نکل سکتا۔ جس کے علم سے تیری کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اُس نے تیری ہدایت کے لئے رُسل بھیجا ہے، اور رُسل کے ذریعہ سے تجھ کو وہ کتاب اور وہ شریعت بھیجی ہے جس کے اتباع سے تو اس حاکم حقیقی کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اگر تو اس کے خلاف عمل کرے گا تو خواہ تیری خلاف ورزی کیسی ہی ڈھکی چھپی ہو، وہ حاکم ضرور تیری گرفت کرے گا۔ اور تجھے سزا دیئے بغیر نہ رہے گا۔ یہ نقش انسان کے دل پر گہرا بٹھا دینے کے بعد وہ اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے، امر و نہی کے احکام دیتا ہے،

اور اسی نقش ایمانی کی قوت سے اپنی تعلیم کا اتباع اور اپنے احکام کی اطاعت کراتا ہے۔ یہ نقش جتنا گہرا ہوگا، اتباع اتنا ہی کامل ہوگا، اطاعت اتنی ہی مضبوط ہوگی، نظام تہذیب و تربیت اتنا ہی طاقتور ہوگا، اور اگر یہ نقش کمزور ہو، یا سرے سے موجود ہی نہ ہو، یا اس کے بجائے کچھ دوسرے نقوش دل پر جمے ہوئے ہوں، تو تعلیم اخلاق محض نقش بر آب ہوگی، امر و نہی کے احکام بالکل بے زور اور بے ہودے ہوں گے، تہذیب و تربیت کا سارا نظام بچوں کا ایک گھروندا ہوگا، جس کے قیام و دوام کا کچھ اعتبار نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ خوشنما ہو، وسیع ہو، بلند ہو، مگر اسمیں استحکام کہاں؟ اس بات کو قرآن حکیم میں ایک مثال کے ذریعہ سے واضح کیا گیا ہے۔

الْمُتَرَكِّفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً
كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ
تُؤْتِي أُكْلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ
الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ه وَمثَلُ كَلِمَةٍ
خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ
الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا
بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ
وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ وَيَفْعَلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ۔

(ابراہیم - ۲۴)

”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کلمہ طیبہ (اعتقاد صحیح) کی کیسی مثال دی ہے وہ گویا ایک اچھا درخت ہے جس کی جڑ خوب جی ہوئی ہے اور شاخیں آسمان تک بلند ہیں۔ وہ اپنے پروردگار کے اذن سے ہمہ وقت پھل لاتا رہتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا

ہے تاکہ وہ سبق حاصل کریں۔ اور کلمہ خبیثہ (اعتقاد باطل) کی مثال ایک خراب درخت کی سی ہے جو زمین کے اوپر سے اُکھڑ دیا جاتا ہے، کوئی جھاؤ اور مضبوطی ہی نہیں رکھتا۔ اللہ ایمان لانے والوں کو ایک قوتِ ثابت (پکے اعتقاد) کے ساتھ دُنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں استحکام بخشتا ہے اور ظالموں کو یوں ہی بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے۔ اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

اب تک ایمانیاتِ خمسہ پر بحیثیت مجموعی نظر کی گئی ہے۔ اب تفصیل کے ساتھ دیکھنا چاہیئے کہ ان پانچوں اُمور میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام نے کیا عقائد پیش کیئے ہیں؟ ہر عقیدہ کی ضرورت و مصلحت کیا ہے؟ انسان کی قوتِ فکری پر اس کا کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ اور ذہن میں اس کے جم جانے سے کس طرح ایک صالح اور نہایت مستحکم سیرت کی تشکیل و تعمیر ہوتی ہے۔

ایمان باللہ

ایمان باللہ کی اہمیت

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کی فرع ہیں اور جتنے اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر اور مرجع خدا کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر ایمان اس لئے ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ خدا نے ان کو مقرر کیا ہے۔ حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ہیں۔ غرض ہر چیز جو اسلام میں ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بنا پر صرف ایمان باللہ قائم ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے، پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و واجبات ہیں، نہ اوامر و نواہی کسی قوت نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

ایمانِ باللہ کا تفصیلی عقیدہ

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کا کام دے رہا ہے، محض اسی قدر نہیں ہے کہ ”اللہ تعالیٰ موجود ہے“ بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور (جس حد تک انسان کے لئے ان کا تصور ممکن ہے) رکھتا ہے، اور اسی تصور صفات سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض ہستی باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جاسکتا ہو۔ دوسری ملتوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا ہے البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز کر دیا ہے وہ یہی ہے کہ اس نے صفاتِ باری کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا ہے اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان بنا کر اس سے ترکیبِ نفس، اصلاحِ اخلاق، تنظیمِ اعمال، نشرِ خیر و منعِ شر، اور بناء تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں کیا۔

ایمانِ باللہ کی مجمل صورت جس کے اقرار باللہ مان احمد تصدیق بالقرآن کو دخولِ اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمہ لا الہ الا اللہ ہے۔ یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ ”الہ“ بجز اُس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ”الوہیت“ کو کائنات جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے اور اُن تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات اور عبادات و طاعات کو ”الوہیت“ کے لئے مخصوص ہیں، اسی ایک ذات سے متعلق کر جائے۔ اس مجمل کلمہ کے اجزاء ترکیبی تین ہیں :-

ایک، اُلُوہیت کا تصور۔

دوسرے، تمام اشیاء سے اس کی نفی۔

تیسرے، صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات۔

قرآن مجید میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

اولاً اس نے ”اُلُوہیت“ کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کی کسی کتاب اور کسی مذہب میں ہم کو نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملتوں میں یہ تصور کسی نہ کسی طور پر موجود ہے۔ لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں ”اُلُوہیت“ نام ہے محض اولیت اور واجبت کا۔ کہیں اس سے محض مبدائیت مراد لی گئی ہے کہیں اس کو قوت اور طاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے۔ کہیں وہ محض خوف اور سبوت کی چیز ہے۔ کہیں وہ صرف محبت کا مرجع ہے کہیں اس کا مفہوم نفع، رفع حاجات اور اجابت دعوات ہے۔ پھر کہیں وہ قابل تجزیہ و تقسیم ہے کہیں اس کو تجسیم اور تشبیہ اور تناسل سے آلودہ کیا گیا ہے کہیں وہ آسمانوں پر متمکن ہے۔ کہیں وہ انسانی مجیس بدل کر زمین پر اتر آئی ہے۔ ان تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے۔ اسی کتاب نے اُلُوہیت کی تقدیس و تجید کی ہے اسی نے بتایا ہے۔ کہ اللہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو بے نیاز، صمد اور قیوم ہو۔ جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو۔ جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب ہو۔ جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو۔ جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو۔ جو زندگی بخشنے اور وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو۔ جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو۔ اس کی

بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں۔ اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو۔ وہی سب کا حساب لینے والا ہو۔ اور اسی کو جزا و سزا کا اختیار ہو۔ پھر یہ اُلُوہیت کی صفات نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے ”آلہ“ ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصّہ سے متصف ہوں۔ نہ یہ وقتی اور زمانی ہیں۔ کہ ایک ”الہ“ کبھی تو ان سے متصف ہو اور کبھی نہ ہو۔ نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک ”الہ“ میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔

اُلُوہیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے انتہائی زورِ بیان کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ کائنات کی جتنی اشیاء اور جتنی قوتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی یہ مفہوم راست نہیں آتا۔ تمام موجوداتِ عالم محتاج ہیں، مُسخر ہیں، کائن و فاسد ہیں۔ نافع و ضار ہونا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو دفع کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کے افعال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں نہیں ہے بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور سے قوتِ وجود، قوتِ فعل اور قوتِ تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ لہذا کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو ”اُلُوہیت“ کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو اور جس کو ہماری نیاز مندوں میں سے کسی ایک حصّہ کا بھی حق پہنچتا ہو۔

اس نفی کے بعد وہ ایک ذات کے لئے ”اُلُوہیت“ ثابت کرتا ہے جس کا نام ”اللہ“ ہے، اور انسان سے مُطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ، اسی کے آگے جھکو، اسی کی تعظیم کرو اسی سے محبت کرو، اسی سے خوف کرو، اسی سے اُمید رکھو، جو کچھ مانگو اسی سے مانگو، ہر حال میں توکل اسی پر کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دالہ اس کے پاس واپس جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا

بُرا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

ایمان باللہ کے اخلاقی فوائد

صفات الہی کے اس تفصیلی تصور کے ساتھ جو ایمان باللہ انسان کے دل میں راسخ ہو جائے۔ وہ اپنے اندر ایسے غیر معمولی فوائد رکھتا ہے جو کسی دوسرے اعتقاد سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

وسعتِ نظر

ایمان باللہ کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ انسان کے زاویہ نظر کو اتنا وسیع کر دیتا ہے جتنی خدا کی غیر محدود سلطنت وسیع ہے انسان جب تک دنیا کو اپنے نفس کے تعلق کا اعتبار کرتے ہوئے دیکھتا ہے، اُس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے۔ جس کے اندر اس کی اپنی قدرت، اس کا اپنا علم، اور اس کے اپنے مملوکیات محدود ہیں۔ اسی دائرے میں وہ اپنے لئے حاجت روا تلاش کرتا ہے اسی دائرے میں جو قوت والے ہیں ان سے ڈرتا اور دیتا ہے اور جو کمزور ہیں اُن پر فوقیت جتاتا ہے۔ اسی دائرے میں اس کی دوستی و دشمنی، محبت اور نفرت، تعظیم اور تحقیر محدود رہتی ہے جس کے لئے بجز اس کے اپنے نفس کے اور کوئی معیار نہیں ہوتا۔ لیکن خدا پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر پھیل جاتی ہے۔ اب وہ کائنات پر اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ خدا کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے۔ اب اس وسیع جہان کی ہر چیز سے اس کا ایک اور ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو ان میں کوئی حاجت روا، کوئی قوت والا، کوئی ضار یا کوئی نافع نظر نہیں آتا۔ اب وہ کسی کو تعظیم یا تحقیر، خوف یا اُمید کے قابل نہیں پاتا۔ اب اس کی دوستی یا دشمنی، محبت یا نفرت اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ خدا کیلئے

ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میں جس خدا کو مانتا ہوں وہ صرف میرا یا میرے خاندان یا میری قوم ہی کا خالق اور پروردگار نہیں ہے بلکہ خالق السموات والارض اور رب العالمین ہے۔ اس کی حکومت صرف میرے ملک تک محدود نہیں بلکہ وہ مالک ارض و سماء اور رب المشرق والمغرب ہے۔ یعنی کہ

(اس کی عبادت صرف میں ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں اس کے آگے ٹھکی ہوئی ہیں۔ وَلَدًا أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا۔ (آل عمران-۹))
(سب اس کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ تَسْبِيحُ لَدَا السَّمَوَاتِ السَّبْعِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ فِيهِنَّ۔ (بنی اسرائیل-۵))

اس لحاظ سے جب وہ کائنات کو دیکھتا ہے تو کوئی اس کو غیر نظر نہیں آتا، سب اپنے ہی اپنے دکھائی دیتے ہیں۔ اسکی ہمدردی اس کی محبت، اس کی خدمت کسی ایسے دائرے کی پابند نہیں رہتی جس کی حد بندی اس کے اپنے نفس کے تعلقات کے لحاظ سے کی گئی ہو۔

پس جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔ اس کی وسیع المشربی کے لئے ”بین الاقوامیت“ کی اصطلاح بھی تنگ ہے۔ اس کو تو حقیقت میں ”آفاقی“ اور ”کائناتی“ کہنا چاہیے
عزت نفس

پھر یہی ایمان باللہ انسان کو پستی و ذلت سے اٹھا کر خودداری و عزت نفس کے بلند ترین مدارج پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس خدا کو نہ پہچانا تھا، دنیا کی ہر طاقتور چیز، ہر نفع یا ضرر پہنچانے والی ہر شاندار اور بزرگ چیز کے سامنے جھکتا تھا۔ اس سے خوف کھاتا تھا

اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اس سے اُمیدیں وابستہ کرتا تھا۔ مگر جب اس نے خدا کو پہچانا تو معلوم ہوا کہ

(جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود محتاج ہیں۔ يَتَّبِعُونَ اِلٰى رَبِّهِمْ الْوَسِيْلَةَ۔ (بنی اسرائیل - ۶۷))

(جن کی وہ بندگی کر رہا تھا وہ خود اس کی طرح بندے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (الاعراف - ۲۴))

(جن سے وہ مدد کی اُمیدیں رکھتا تھا وہ اس کی مدد تو درکنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے۔ لَا يَسْتَطِيعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَا اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۔ (الاعراف - ۱۲۴))

(حقیقی طاقت کا مالک تو خدا ہے، اِنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا۔ (البقرہ - ۱۲۰))

(وہی حکمران اور صاحب امر ہے، اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (الانعام - ۷۷))

(حامی و مددگار اس کے سوا کوئی نہیں، وَمَا لَكُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَلَا نَصِيْرٍ۔ (البقرہ - ۱۱۳))

(مدد اسی کی جانب سے ہوتی ہے، وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ (آل عمران - ۱۱۳))

(رزق دینے والا وہی ہے، اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ (الذّٰرِیَّت - ۳))

(زمین و آسمان کی کُنیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، لَمَّا مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الشوریٰ - ۲))

مارنے اور جلالنے والا وہی ہے۔ یعنی کہ
(اُس کے اذن کے بغیر نہ کوئی کسی کو مار سکتا ہے نہ بچا سکتا)

ہے، وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ۔ (آل عمران - ۱۵)
(اور زندہ کرنے اور مارنے والا اللہ تعالیٰ ہے، وَاللَّهُ يُحْيِي

وَيُمِيتُ۔ (آل عمران - ۱۴))

(نفع و ضرر پہنچانے کی اصلی طاقت اسی کے ہاتھ میں ہے،
وَإِنْ يَسْأَلْكَ اللَّهُ بَصِيرَ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يُرِدْكَ
بِخَيْرٍ فَلَا رَآءَ لِفَضْلِهِ۔ (یونس - ۱۱))

یہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوتوں سے بے
نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ خدا کے سوا اس کی گردن کسی کے
آگے نہیں جھکتی۔ خدا کے سوا اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا۔
خدا کے سوا کسی کی عظمت اس کے دل میں نہیں رہتی۔ خدا کو چھوڑ کر
وہ کسی دوسرے سے اُمیدیں وابستہ نہیں کرتا۔
انکسار و تشنّع

لیکن یہ خودداری وہ جھوٹی خودداری نہیں ہے جو اپنی قوت،
دولت یا قابلیت کے گھنڈ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ عزت نفس وہ عزت
نفس نہیں ہے۔ جو ایک بر خود غلط انسان میں نخوت و عروج اور تکبر
کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے خدا کے ساتھ اپنے اور
اور تمام موجوداتِ عالم کے تعلق کو ٹھیک سمجھ لینے کا۔ ایسے
خدا پر ایمان رکھنے والے میں خودداری انکسار کے ساتھ، اور عزت
نفس خشوع و خضوع کے ساتھ ہم رشتہ ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ
خدا کی طاقت کے سامنے میں بالکل بے بس ہوں۔ ارشاد ہے:-

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ۔ (الانعام - ۸)

خدا کی فرمانروائی سے نکلنا میرے اور کسی ہستی کے بس میں
نہیں ہے۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:-

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا
مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا، كَلَّا
تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ۔ (الرحمان - ۲)

(میں کیا تمام عالم خدا کا محتاج ہے اور خدا بے نیاز ہے، واللہ
الغنی وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ۔ (محمد - ۱۴)

(زمین و آسمان میں جو کچھ ہے خدا کا ہے، لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ (البقرہ - ۱۲۰)

اور مجھے بھی جو نعمت ملی ہے خدا سے ملی ہے، وَمَا بِكُمْ مِنْ
نِعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ۔ (النحل - ۷)

اس عقیدہ کے بعد غرور تکبر کہاں رہ سکتا ہے۔ ایمان باللہ کا تو
خاصہ لازم یہ ہے کہ وہ انسان کو سراپا انکسار بنا دیتا ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ
هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا۔

(الفرقان - ۶)

”خداے رحمان کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی
کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جہلہ ان سے جہالت کی باتیں کرتے
ہیں تو وہ سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔“

غلط توقعات کا ابطال

خالق اور مخلوق کے تعلق کی صحیح معرفت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے
کہ اس سے ان تمام غلط توقعات اور جھوٹے بھروسوں کا خاتمہ ہو
جاتا ہے جو عدم معرفت کا نتیجہ ہیں اور انسان خوب سمجھ لیتا ہے کہ
اس کے لئے اعتقاد صحیح اور عمل صالح کے سوا فلاح و نجات کا اور
کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جو لوگ اس معرفت سے محروم ہیں ان میں سے

کوئی سمجھتا ہے کہ خدا کے کاموں میں بہت سے اور چھوٹے چھوٹے
خدا بھی شریک ہیں۔

(ہم ان کی خوشامد کر کے سفارش کرا لیں گے، وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ
شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللَّهِ۔ (یونس-۱۲)

کوئی سمجھتا ہے کہ خدا بیٹا رکھتا ہے اور اس بیٹے نے ہمارے لئے
کفارہ بن کر نجات کا حق محفوظ کر دیا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ
(ہم خود اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، قَالَتِ الْيَهُودُ
وَالنَّصَارَى نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ۔ (المائدہ-۳)

ہم خواہ کچھ کریں، ہمیں سزا نہیں مل سکتی۔ ایسی ہی اور بہت سی
غلط توقعات ہیں جو لوگوں کو ہمیشہ گناہ کے چکر میں پھنسا کر رکھتی ہیں
کیونکہ وہ ان کے بھروسہ پر اپنے نفس کی پاکیزگی اور عمل کی اصلاح سے
غافل ہو جاتے ہیں۔ لیکن قرآن جس ایمانِ با اللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ اس
میں غلط توقعات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی
قوم خدا کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی۔

(سب اس کے مخلوق ہیں اور وہ سب کا خالق، بَلْ أَنْتُمْ
بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ۔ (المائدہ-۳)

(بزرگی اور اختصاص جو کچھ ہے تقویٰ کی بنا پر ہے، إِنَّ الْزَّمَكُمُ
عِنْدَ اللَّهِ أَتَقَكُمُ۔ (الحجرات-۲)

(خدا نہ اولاد رکھتا ہے نہ کوئی اس کا شریک و مددگار ہے، لَمْ
يَتَّخِذْ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهَا شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهَا
وَلِيٌّ مِّنَ الدِّالِّ۔ (نبی اسرائیل-۱۲)

(جن کو تم اس کی اولاد یا اس کا شریک سمجھتے ہو وہ سب اس کے
بندے اور غلام ہیں، بَلْ لَّهَا مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلِّ لَهَا

قَانِتُونِ۔ (البقرہ-۱۴)

(کسی میں جرأت نہیں کہ اس کے اذن کے بغیر سفارش کر سکے،

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ۔ (البقرہ-۲۲)

(اگر تم نافرمانی کرو گے تو کوئی سفارشی اور مددگار تمہیں اس کی

پاداش سے بچا نہ سکے گا، وَإِذَا أَمَّا لِلَّهِ بِقَوْمٍ سُوءٌ فَلَا مَرَدَّ

لَهُ وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ وَالٍ۔ (الرعد-۲)

رجائیت اور اطمینانِ قلب

اسی کے ساتھ ایمان باللہ انسان میں ایک ایسی رجائی کیفیت پیدا

کر دیتا ہے جو کسی حال میں مایوسی اور شکستہ دلی سے مغلوب نہیں

ہوتی۔ مومن کے لئے ایمان اُمیدوں کا ایک لازوال خزانہ ہے جس

سے قوتِ قلب و تسکینِ روح کی دائمی اور غیر منقطع رسد اس کو پہنچتی

رہتی ہے۔ چاہے وہ دنیا کے تمام دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے،

سارے اسبابِ کارشتہ ٹوٹ جائے، وسائل و ذرائع ایک ایک کر

کے اُس کا ساتھ چھوڑ دیں، مگر ایک خدا کا سہارا اس کا ساتھ کبھی

نہیں چھوڑتا اور اس کے بل پر وہ ہمیشہ اُمیدوں سے لبریز رہتا ہے

اس لئے کہ جس خدا پر وہ ایمان لایا ہے وہ کہتا ہے کہ

(میں تمہارے قریب ہوں اور تمہاری پیکار سنتا ہوں، وَإِذَا

سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا

دَعَانِ۔ (البقرہ-۱۸۳)

(مجھ سے ظلم کا خوف نہ کرو کہ میں ظالم نہیں ہوں، وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ۔ (آل عمران-۱۱۹)

بلکہ میری رحمت کے اُمیدوار ہو کہ

(میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے، وَمَا صَدَّقَتْ وَاسِعَتْ كُلَّ

شَیْءٌ۔ (اعراف-۱۹)

(میری رحمت سے مایوس تو وہ ہوتے ہیں جو مجھ پر ایمان نہیں رکھتے، اِنَّہٗ لَا یَسْتَسِیْ مِنْ تَرَاوِجِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (یوسف-۱۰)

رہا مومن تو اس کے لئے مایوسی کا کوئی مقام نہیں۔

(اگر اس نے کوئی قصور کیا ہو تو مجھ سے معافی مانگے، میں اس کو معاف کر دوں گا، وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسًا ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (النساء-۱۴)

اور

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا
مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔
(الزمر-۶)

(اگر دنیا کے اسباب اس کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ ان پر بھروسہ چھوڑ کر میرا دامن تھام۔۔۔ پر خوف و حزن اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا، اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَنْزَلَ عَلَیْہُمْ الْمَلٰٓئِکَةُ اِلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا۔ (طہ السجدہ-۲۴)

(میری یاد وہ چیز ہے جس سے دلوں کو سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے، اِلَّا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَیْنُ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد-۲۸)

صبر و توکل

پھر یہی رجائیت ترقی کر کے صبر و استقامت اور توکل علی اللہ کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ جاتی ہے۔ جہاں مومن کا دل ایک سنگین چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے، اور ساری دنیا کی مشکلیں، دشمنیاں، تکلیفیں، مضرّیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں

ہلا سکتیں۔ یہ قوت انسان کو بجز ایمان باللہ کے اور کسی ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا بھروسہ اُن مادی یا وہمی اسباب و وسائل پر ہوتا ہے جو خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے بل پر جینے والا گویا تار عنکبوت کا سہارا لیتا ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:-

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ
كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ
الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ۔ (العنکبوت۔ ۴)

(ایسے کمزور سہاروں پر جس کی زندگی کا مدار ہو اس کا کمزور ہو جانا تو یقینی ہے، ضَعْفُ الطَّالِبِ وَالْمَطْلُوبِ۔ (الحج۔ ۱۰))

(مگر جس کا بھروسہ خدا پر ہے، جس نے خدا کا دامن تھام لیا ہے، اس کا سہارا ایسا مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا، وَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ (البقرہ۔ ۱۲۲))

(اس کے ساتھ تو رب السموات والارض کی طاقت ہے، اس پر کون سی طاقت غالب آ سکتی ہے؟ اِنْ يَتَّصِرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ۔ (آل عمران۔ ۱۷))

اس کو تو تمام جہان کی مصیبتیں مل کر بھی صبر و ثبات اور پامردی و استقامت کے مقام سے نہیں ہٹا سکتیں۔ کیونکہ

(اس کے نزدیک سب بُرا اور بھلا اللہ کی طرف سے ہے، قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔ (النساء۔ ۱۱))

(جو مصیبت بھی آتی ہے تقدیرِ الہی کے تحت آتی ہے اور اس کا ٹالنے والا بھی بجز اللہ کے کوئی نہیں ہے، قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا

مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُونَ۔ (التوبہ۔ ۷)۔

انبیاء علیہم السلام نے جس فوق البشری قوت سے دنیا کی ہولناک مصیبتوں کا مقابلہ کیا، تنہا بڑی بڑی سلطنتوں اور طاقتور قوموں سے تبرد آزما ہوئے، اسباب دُروغی کے بغیر دنیا کو مسخر کرنے کا عزم لے کر اُٹھے، اور مشکلات کے طوفانوں میں بھی اپنے مشن سے نہ ہٹے، وہ یہی صبر و توکل کی قوت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے۔ اپنے ملک کے جبار فرماں روا سے مناظرہ کرتے ہیں، بے خوف آگ میں کود پڑتے ہیں۔ اور آخر اِنِّیْ ذَاہِبٌ اِلَیْ رَبِّیْ سَیْهْدِیْنَ کہہ کر کسی سروسامان کے بغیر وطن سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت ہودؑ کو دیکھئے۔ کسی طرح عادی زبردست قوت کو چیلنج دیتے ہیں۔

فَکَیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنَ اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ
عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مَّامِنْ ذَابَتْ اِلَّا هُوَ اِخِذْ
بِنَاصِیَتِہَا۔ (ہود۔ ۵)

”تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ

دو۔ میں تو اس خدا پر بھروسہ کر چکا ہوں جو میرا اور تمہارا رب ہے

وہی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔“

حضرت موسیٰؑ کو دیکھئے۔ خدا کے بھروسے پر فرعون کی زبردست طاقت سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ قتل کی دھمکی دیتا ہے تو جواب دیتے ہیں کہ میں ہر شکبر کے مقابلہ میں اس کی پناہ لے چکا ہوں جو میرا اور تم سب کا رب ہے، اِنِّیْ عُوْذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ (المومن۔ ۳) مصر سے نکلتے وقت فرعون اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کا پیچھا کرتا ہے۔ ان کی بزدل قوم گھبرا کر کہتی ہے کہ دشمنوں نے ہم کو آیا، اِنَّا

لَمَّا كُنَّا مَعَهُ - مگر وہ انتہائی سکونِ قلب کے ساتھ کہتے ہیں ہرگز نہیں
 اللہ میرے ساتھ ہے، وہی مجھ کو سلامتی کی راہ پر لگا دے گا۔ کَلَّا
 اِنْ مَّعِيَ سَائِجِدُ لِلَّذِيْنَ (الشعراء - ۴) سب سے آخر میں نبی عربی علیہ
 الصلوٰۃ والسلام کو دیکھئے۔ ہجرت کے موقع پر ایک غار میں تشریف
 رکھتے ہیں۔ صرف ایک رفیق ساتھ ہے۔ خون کے پیاسے کفار سر پر
 پہنچتے ہیں۔ مگر آپ اس وقت بھی مضطرب نہیں ہوتے۔ اپنے
 ساتھی سے فرماتے ہیں، لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ (التوبہ - ۶)،
 ”ہرگز نہ گھبراؤ اللہ ہمارے ساتھ ہے“ یہ ناقابلِ تسخیر قوت، یہ آہنی عزم،
 یہ پہاڑ کی سی استقامت، بجز ایمان باللہ کے اور کس چیز سے حاصل
 ہو سکتی ہے؟
 شجاعت

اسی سے ملتی جلتی ایک اور صفت بھی ہے جو ایمان باللہ سے
 غیر معمولی طور پر پیدا ہوتی ہے، یعنی جرأت و بسالت اور شجاعت و
 شہامت۔ انسان کو دو چیزیں بُزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی
 جان، اپنے اہل و عیال اور اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف
 جو نتیجہ ہے اس غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے
 کی قوت دراصل اُن اشیاء میں ہے جو محض آلہ کے طور پر استعمال ہوتی
 ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ مومن
 کے رگ و پے میں یہ اعتقاد سرایت کر جاتا ہے کہ خدا سب سے زیادہ
 محبت کا حق رکھتا ہے، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ (البقرہ - ۲)
 اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال اور اولاد سب دنیا کی
 زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی ضائع ہونا یقینی ہے، کبھی نہ ضائع ہونے
 والی چیز وہ ہے جو خدا کے ہاں ملے گی۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زَيْنٰتٌ

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَةِ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا
وَّخَيْرٌ أَمَلًا۔ (الکہف-۶) دُنیا کی زندگی محض چند روزہ ہے۔ اس کو
ہم بچانے کی لاکھ کوشش کریں، موت بہر حال ایک دن آکر رہے
گی، قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلْقِيكُمْ
(الجمہ-۱) اَیْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكُكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ
مُشِيدَةٍ۔ (النساء-۱۱) پھر کیوں نہ اس جان کو دائمی مسرت کی زندگی
کے لیے قربان کر دیں جو اللہ کے ہاں ملے گی؟ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ
قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ
فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ۔ (آل عمران-۱۶) کیوں نہ دُنیا
کے چند روزہ لطف اور عارضی فائدوں کو اس خدا کی خوشی پر فدا کر
دیں جو دراصل ہماری جان اور مال کا مالک ہے اور جو انکے بدلے
میں اس سے بہتر زندگی اور ان سے زیادہ حقیقی فائدے بخشنے والا
ہے؟ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ
بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔
(التوبہ-۱۲)۔

زبا خوف تو مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نقصان پہنچانے اور
ہلاک کرنے کی حقیقی قوت انسان یا حیوان، توپ یا تلوار، لکڑی یا
پتھر میں نہیں ہے، بلکہ خدا کے قبضہ قدرت میں ہے۔ تمام دُنیا کی
قوتیں بل کر بھی اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کا اذن نہ ہو تو
اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا، وَمَا هُمْ بِضَائِرِينَ بِهَا مِنْ
أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ۔ (البقرہ-۱۲) موت کا جو وقت خدا نے رکھ دیا
ہے اس سے پہلے کسی کے لئے موت نہیں آ سکتی، وَمَا كَانَ
لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُوَجَّلًا۔ (آل عمران-۱۵)

اور اگر موت کا کھا ہوا وقت آن پہنچے تو پھر وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں
 سکتی، قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ
 إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ۔ (آل عمران - ۱۶)۔ پس جب معاملہ یہ ہے تو لوگو! اس
 سے ڈرنے کے بجائے خدا سے ڈرنا چاہیے۔ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا
 اِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ۔ (آل عمران - ۱۸) وہی حقیقت میں ایسی ہستی ہے
 جس سے ڈرا جائے، وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْا (الاحزاب - ۵) راہِ خدا
 میں لڑنے سے جی چرانا تو ان کا کام ہے جن کے دل میں ایمان نہیں،
 اس لئے کہ وہ خدا سے زیادہ بندوں سے ڈرتے ہیں، يَخْشَوْنَ
 النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً۔ (النساء - ۱۱) ورنہ چھپے
 مومن ہیں وہ تو دشمنوں کے دل بادل دیکھ کر بجائے ڈرنے کے اور
 زیادہ شیر ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کا بھروسہ دنیوی طاقت پر نہیں
 خدا پر ہے۔

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ
 فَاَخْشَوْهُمْ فَرَّادَهُمْ اِيْمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنَعْمَ
 الْوَكِيْلُ۔ (آل عمران - ۱۸)

قناعت و استغناء

پھر یہی ایمان باللہ انسان کے دل سے حرص و ہوس اور رشک و
 حسد کے وہ رکیک جذبات بھی دور کر دیتا ہے جو اسکو جلبِ منفعت کیلئے
 ذلیل و ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر ابھارتے اور بنی نوعِ انسان کو میانِ فساد برپا کرتے ہیں
 ایمان کیساتھ انسان میں قناعت اور استغناء پیدا ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے
 مقابلہ یا مناقبت نہیں کرتا۔ ظلم و عدوان کی وادیوں میں دوڑ دھوپ نہیں کرتا
 ہمیشہ باعزت طریقہ سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے۔ اور جو
 مقہور یا بہت مل جاتا ہے اس کو خدا کی دین سمجھ کر قناعت کر لیتا ہے۔

مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو چاہتا ہے بخشا ہے، قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهَا مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ۔ (آل عمران ۸) رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو جتنا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ۔ (الرعد ۳)۔ حکومت اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے حکمران بنادے، إِنَّ الْأَمْرَ لِلَّهِ يُوَفِّرُهُمَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (اعراف ۱۵) عزت و دولت اس کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے عزیز بنادے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (آل عمران ۳)۔ پھر دنیا کا یہ نظام کہ عزت و دولت قوت، حسن، ناموری اور دوسرے مواہب کے اعتبار سے کوئی گھٹا ہو یا ہے اور کوئی بڑھا ہوا، دراصل خدا ہی کا قائم کردہ ہے، خدا اپنی مصلحتوں کو خود بہتر جانتا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے نظام کو بدلنے کی کوشش کرنا نہ تو انسان کے لئے مناسب ہے اور نہ اس میں کامیابی ممکن ہے۔ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل ۱۸)۔ وَلَا تَسْتَوُوا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ۔ (النساء ۵)

اصلاح اخلاق و تنظیم اعمال

ان سب سے زیادہ اہم فائدہ وہ ہے جو ایمان باللہ سے تمدن کو پہنچتا ہے۔ اس سے انسانی جماعت کے افراد میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندی قانون کی جس پیدا ہوتی ہے۔ اطاعت امر اور ضبط و نظم کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے اندر ہی اندر سدھ کر ایک صالح اور

منظم سوسائٹی بنانے کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل ایمانِ باللہ کا معجزہ ہے اور اسی کے لئے مخصوص ہے۔ دنیا کی کسی حاکمانہ قوت، یا تعلیم و تربیت، یا وعظ و تلقین سے اصلاحِ اخلاق اور تنظیمِ اعمال کا کام اتنے وسیع پیمانے اور اتنی گہری بنیادوں پر انجام نہیں پاسکتا۔ دنیوی قوتوں کی رسائی رُوح تک نہیں صرف جسم تک ہے اور جسم پر بھی ان کی گرفت ہر جگہ اور ہر وقت نہیں ہے۔ تعلیم و تربیت اور وعظ و تلقین کا اثر بھی صرف عقل و فکر تک محدود رہتا ہے اور وہ بھی ایک حد تک۔ رہا نفسِ امارہ تو وہ نہ صرف خود اس سے غیر متاثر رہتا ہے بلکہ عقل کو بھی مغلوب کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ لیکن ایمان وہ شے ہے جو اپنی اصلاحی اور تنظیمی قوتوں کو لیے ہوئے انسان کے قلب و رُوح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور وہاں ایک ایسے طاقتور اور بیدار ضمیر کو نشوونما دیتا ہے جو ہر وقت ہر جگہ انسان کو تقویٰ اور طاعت کی سیدھی راہ دکھاتا رہتا ہے اور شر سے شریعہ نفوس میں بھی اپنی ملامتوں اور سرزنشوں کا کچھ نہ کچھ اثر پہنچائے بغیر نہیں رہتا

یہ عظیم الشان فائدہ علمِ الہی اور قدرتِ خداوندی کے اُس اعتقاد سے حاصل ہوتا ہے جو ایمان کا ایک ضروری جز ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ انسان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ خدا کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اور کوئی بات اس سے چھپ نہیں سکتی۔

وَاللّٰهُ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَإِنَّمَا تَوَلَّوْا فِشْمًا

وَجَدُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ وَّاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (البقرہ-۱۲)

”مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے تم چہرئیں کرو گے

اُدھر اللہ موجود ہے، یقیناً اللہ بڑی وسعت والا اور جاننے والا

”ہے“

أَيُّهَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمْ اللَّهُ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ

عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (البقرہ-۱۸)

”تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تم سب کو پکڑ بلائے گا، یقیناً

اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا

فِي السَّمَاءِ۔ (آل عمران-۱)

”یقیناً اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے نہ زمین میں اور نہ

آسمان میں۔“

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنَ سَّمَاءٍ

إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا خَبْرَتٌ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ

وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ۔ (الانعام-۷)

”اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کا علم اس کے سوا کسی

کو نہیں۔ بر و بحر میں جو کچھ ہے سب کو وہ جانتا ہے۔ ایک پتہ بھی

اگر زمین پر گرنا ہے تو اللہ کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اور زمین کے

تاریک تہوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور خشک و تر چیز ایسی نہیں

جو ایک کتابِ تمہیں میں لکھی ہوئی موجود نہ ہو۔“

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ

بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔

(ق-۲)

”ہم نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم وہ باتیں تک جانتے

ہیں جن کا وسوسہ اس کے نفس میں آتا ہے۔ ہم اس کی شہ رگ سے

بھی زیادہ اس سے قریب ہیں۔“

مَا يَكُونُ مَنْ تَجْوِي ثَلَاثَةً إِلَّا هُوَ سَابِعُهُمْ
وَلَا خَمْسَةً إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَذْنَىٰ مِنْ
ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ آيْنَ مَا كَانُوا۔

(المجادلہ-۲)

”کوئی سرگوشی تین آدمیوں میں ایسی نہیں ہوتی۔ جس میں چوتھا خدا
نہ ہو، اور کوئی سرگوشی پانچ آدمیوں میں ایسی نہیں ہوتی جس میں
چھٹا خدا نہ ہو۔ اور نہ اس سے کم یا زیادہ آدمیوں کا کوئی اجتماع
ایسا ہے جس میں وہ ان کے ساتھ نہ ہو، خواہ وہ کہیں ہو۔“

يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ
اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ
الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا۔ (النسارہ-۱۴)

”وہ لوگوں سے چھپ سکتے ہیں، مگر خدا سے نہیں چھپ
سکتے۔ خدا اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ اس کی
رضا کے خلاف راتوں کو چھپ کر باتیں کرتے ہیں اور وہ جو کچھ
بھی کرتے ہیں اس پر خدا محیط ہے۔“

أَوْ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسْرُونَ وَمَا
يُعْلِنُونَ۔ (البقرہ-۹)

”کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ خفیہ اور علانیہ جو کچھ بھی کرتے ہیں
خدا کو اس کا علم ہے۔“

إِذْ يَتَلَقَّى السُّلَقَيْنِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ
قَعِيدًا، مَا لِمِظْمُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهَا رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔

(ق-۲)

”دو ضبط کرنے والے فرشتے ہر شخص کے دائیں اور بائیں بیٹھے ضبط کر رہے ہیں، کوئی بات زبان سے ایسی نہیں نکلتی کہ کوئی نگرانی کرنے والا اس کو لکھنے کے لیے تیار نہ ہو۔“

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ
وَمَنْ هُوَ مُسْتَخَفٌّ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ لَمَّا
مُعَقَّبَتْ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهَا وَمِنْ خَلْفِهَا يَحْفَظُونَهَا
مِنْ أَمْرِ اللَّهِ۔ (الرعد-۲)

”خواہ تم میں سے کوئی چھپا کر بات کرے یا بے انگ دہلے، اور خواہ کوئی رات کی تاریکیوں میں پوشیدہ ہو یا دن کی روشنی میں چل رہا ہو، ہر حال اس کے آگے اور پیچھے خدا کے جاسوس لگے ہوئے ہیں جو خدا کے حکم سے اس کی نگہبانی کر رہے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی خوب اچھی طرح انسان کے ذہن نشین کر دی گئی ہے کہ ایک دن ضرور خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے
وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوَةٌ (البقرہ-۲۸) وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهَا
تُحْشَرُونَ (البقرہ-۲۵)۔ اور اس کو ہر چیز کا حساب دینا ہے اِنَّ اللّٰهَ
كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا (النساء-۱۱) اور اللہ کی پکڑ بڑی سخت
ہے، اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ۔ (البروج)۔

یہ عقیدہ جس کو طرح طرح سے دل میں بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، دراصل اسلام کے پورے قانون کی قوت نافذ ہے۔ اسلام نے حرام و حلال کے جو حدود بھی مقرر کیے ہیں، اخلاق، معاشرت اور معاملات کے متعلق جو احکام بھی دیئے ہیں، ان کے نفاذ کا اصلی انحصار نہ فوج اور پولیس پر ہے، اور نہ تعلیم و تلقین پر۔ بلکہ وہ نفاذ کی قوت اس عقیدہ سے حاصل کرتے ہیں کہ ان کا مقرر کرنے والا

ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ کا مقصد

فرشتوں پر ایمان دراصل ایمان باللہ کا تتمہ اور اس کا ضمیمہ لازمہ ہے۔ اس کا مقصد محض یہی نہیں ہے کہ ملائکہ کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے، بلکہ مقصد اصلی یہ ہے کہ نظام وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے، تاکہ ایمان باللہ خالص توحید پر قائم ہو، اور شرک و عبادت ماسوی اللہ کے تمام شاہدوں سے پاک ہو جائے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، ملائکہ کا ایک اجمالی تصور تمام ملتوں اور مذہبوں میں کسی نہ کسی طرح موجود رہا ہے۔ اسی تصور پر مختلف مذاہب نے مختلف اعتقادات کی عمارتیں قائم کر لی ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ نوابی فطرت اور قدرت کی وہ طاقتیں ہیں جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو چلا رہی ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ دیوتا ہیں جن میں سے ہر ایک کارگاہ عالم کے ایک ایک محکمہ کا صدر ہے، مثلاً کوئی ہوا کا مالک، کوئی بارش کا، کوئی روشنی کا اور کوئی حرارت یا آگ کا۔ کسی کے اعتقاد میں وہ خدا کے نائب اور مددگار ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ارباب الانواع ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ عقول ہیں۔ کسی کی رائے میں وہ خدا کے تصورات ہیں۔ اور کوئی ان کو خدا کی اولاد سمجھتا ہے۔ پھر کسی نے ان کا مادی جسمانی وجود مانا ہے۔ کسی نے ان کو مجردات و مفارقات میں سے شمار کیا ہے۔ کسی نے ان کو سیارات و نیرات کے ساتھ متحد الوجود کر دیا ہے۔ اور کسی نے ان کے

متعلق دوسرے عجیب و غریب تصورات قائم کیے ہیں۔ فی الجملہ ارباب مذاہب میں فرشتوں کے متعلق یہ اعتقاد عام رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی خدائی میں شریک ہیں، اور اس لیے ان کے سیکل یا بُت بنا کر، یا ان کی تصویریں نقش کر کے ان کی عبادت کی گئی ہے، ان سے دُعائیں مانگی گئی ہیں، ان کو حاجت روا، فریادرس اور شفیع قرار دیا گیا ہے، اور اسی کی بدولت دنیا میں شرک کا ہنگامہ گرم رہا ہے۔

نظام وجود میں فرشتوں کی حیثیت

قرآن مجید نے ایک طرف خدا کے وجود، صفات اور افعال میں خالص اور کامل توحید قائم کی، اور دوسری طرف ملائکہ کا ایک صحیح تصور پیش کیا تاکہ وہ دروازہ ہی بند ہو جائے جس سے شرک داخل ہوتا ہے۔ اس نے فرشتوں کی حقیقت سے کوئی بحث نہ کی کہ یہ بحث دُور از کار ہے، اپنے اندر کوئی جوہریت نہیں رکھتی۔ انسان کے لیے نہ اس میں کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کو انسان سمجھ سکتا ہے۔ اصل مسئلہ جو تصفیہ طلب تھا وہ صرف یہ تھا کہ نظام وجود میں فرشتوں کی حیثیت کیا ہے، اور اس کو قرآن مجید نے خوب واضح کر دیا۔ اس نے بتایا کہ فرشتے خدا کی اولاد نہیں، نہ اس کے شریک کار ہیں، بلکہ محض اس کے بندے اور غلام ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا سُبْحَانَ، بَلْ
عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ، لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ
بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ
وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ أَسْرَفَ تَصْلَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ
مُشْفِقُونَ۔ (الانبیاء-۲)

”کافروں نے کہا کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ پاک ہے اس کی ذات۔ وہ (فرشتے) تو اس کے معزز بندے ہیں، اس کے آگے بڑھ کر بات تک نہیں کر سکتے، اور بس وہی کرتے ہیں جس کا وہ حکم دیتا ہے۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے سب کو خدا جانتا ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کر سکتے سوائے اس کے جسے خدا پسند فرماتا ہو اور وہ جلالِ خداوندی سے ڈرتے رہتے ہیں۔“

ان کی حیثیت مدبرِ امتِ امر کی ہے (التازعات-۱) یعنی وہ صرف اُن اُمور کی تدبیر کرتے ہیں جو اللہ نے ان کے سپرد کر دیئے ہیں خدائی میں شریک ہونا تو درکنار ان میں اتنی مجال بھی نہیں کہ اس کے حکم سے یک سرِ نمو تجاوز کر سکیں۔ ان کا کام تو محض اطاعت اور عبادت ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے وظیفہ سے غافل نہیں ہوتے اور ہر دم اپنے رب کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

يُسَبِّحُ الرَّبَّ ذِكْرًا عَمْدًا وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ

(الرعد-۲)

”بجلی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتی ہے۔ اور

فرشتے خوف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔“

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
مِنْ ذٰلَبًا وَّالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ،
يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔

(النحل-۶)

”اللہ کے آگے سر بسجود ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین

میں چلتے پھرتے ہیں، اور ملائکہ، وہ سربازی نہیں کرتے اپنے رب

سے جو ان سے بالاتر ہے، ڈرتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔“

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ
عِنْدَكَ لَا يَسْتَغْنٰوْنَ عَنْ عِبَادَتِكَ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ
يُسَبِّحُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْثُرُوْنَ۔ (الانبیاء۔ ۲)

”اسی کے مملوک ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں
ہیں اور جو اس کے پاس (مقرب) ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے
سرتابی نہیں کرتے۔ تھکتے نہیں، شب و روز اس کی تسبیح میں
لگے رہتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔“

لَا يَعْصُوْنَ اِلٰهًا مَّا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا
يُؤْمَرُوْنَ۔ (التحریم۔ ۱)

”وہ کبھی اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے جو خدا
نے اُن کو دیا ہے، اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا
ہے۔“

اس تصور نے شرک کے لئے کوئی نبجائش باقی نہ رکھی۔ کیونکہ
جن پر خدائی کا گمان کیا جاسکتا تھا وہ سب ہماری طرح عاجزو
درماندہ بندے ثابت ہو گئے۔ اس کے بعد ہماری عبادتوں، ہماری
نیاز مندیوں، ہماری استعانتوں اور ہمارے اعتماد و توکل کا مرجع
بجز خدا کی ذات کے اور کون ہو سکتا ہے؟
انسان اور فرشتوں کی اضافی حیثیت

پھر یہی نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر قرآن مجید نے انسان اور
ملائکہ کی اضافی حیثیت بھی بتادی ہے تاکہ انسان ان کے مقابلہ میں
اپنے مرتبے کو اچھی طرح سمجھ لے۔ کلام الہی میں جہاں تخلیق آدم کا

ذکر کیا گیا ہے وہاں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اَبُو
البشر حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا تو ملائکہ کو
ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور بجز ابلیس کے اور سب نے
ان کو سجدہ کیا (بقرہ - ۲ - اعراف - ۲ - بنی اسرائیل - ۷ - کہف - ۷ - طہ - ۷ -
ص ۸) - ملائکہ نے اپنی تسبیح و تقدیس کی بنا پر آدم علیہ السلام کے
مقابلہ میں اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا تو حق تعالیٰ نے ان کے اس
دعویٰ کو رد فرمادیا اور امتحان لے کر ثابت کر دیا کہ ہم نے آدم کو تم
سے زیادہ علم بخشا ہے - ابلیس نے اپنے مادہ تخلیق کو بنائے فضیلت
قرار دے کر آدم کی بزرگی تسلیم کرنے اور ان کے آگے سر بسجود ہونے
سے انکار کیا تو اسے ہمیشہ کے لیے راندہ درگاہ کر دیا گیا - یہ چیز ایک
طرف انسان میں عزت نفس کا احساس پیدا کرتی ہے، اور دوسری
طرف اس کے تمام جذبات عبودیت کو خدا پرستی کے مرکز پر سمیٹ
لاتی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام وجود میں کوئی شے بجز
حق تعالیٰ کے انسان سے افضل نہیں ہے - ملائکہ اگرچہ عِبَادٌ مُّکْرَمُونَ
ہیں اور تمام دوسری اشیاء پر فضیلت رکھتے ہیں، مگر انسان کے
آگے وہ بھی سر بسجود، ہو چکے ہیں - پھر انسان کا مسجود، اس کا معبود،
اس کا مستعان و مجیب الدعوات، حضرت حق کے سوا اور کون ہو
سکتا ہے؟

اس طرح ایمان بالملائکہ کے صحیح علم و معرفت پر قائم ہو جانے
سے ایمان باللہ بالکل خالص اور منزہ ہو جاتا ہے -

ایمان بالملائکہ کا دوسرا مقصد

ملائکہ کی دوسری حیثیت جو قرآن مجید میں بتائی گئی ہے یہ ہے
کہ اللہ تعالیٰ انہی کے ذریعہ سے اپنے پیغمبروں کے پاس اپنا کلام

اور اپنے احکام بھیجتا ہے، اور انہی کے ذریعہ سے اس امر کا اہتمام فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو یہ پیغام ہر آمیزش، ہر التباس، ہر اشتباہ اور ہر خارجی و خل اندازی سے پاک رہ کر پہنچ جائے۔ یہ فرشتے اول تو بجائے خود فرماں بردار اور نیک فطرت ہیں۔ ہر قسم کے بُرے رُحانات اور نفسانی اغراض سے منزہ ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے حکم کی بے چون و چرا اطاعت کرنے والے ہیں۔ اسی لئے جو پیغام ان کے ذریعہ سے بھیجا جاتا ہے اس میں کسی قسم کی کمی و بیشی وہ اپنی طرف سے نہیں کرتے اور نہیں کہہ سکتے۔ دوسرے، وہ اس قدر طاقتور ہیں کہ ان کی پیغام رسانی اور نگرانی میں کوئی شیطانی قوت ذرہ برابر بھی خلل نہیں ڈال سکتی۔ یہ مضمون قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔

فِي صُحُفٍ مُّكْتَرَمَةٍ مَّزْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي

سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ۔ (عبس)

”وہ ایسے معزز اور بلند پایہ اور پاک صحیفوں میں مندرج

ہے جو بڑے ذی عزت اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں لکھے گئے

ہیں۔“

إِنَّمَا لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ

ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ۔ (التکویر)

”بے شک وہ ایک بزرگ فرشتے کا بیان ہے جو بڑی قوت

والا ہے، صاحب عرش کے ہاں بڑی منزلت رکھتا ہے۔ مطاع ہے۔

اور وہاں کا معتبر ہے۔“

عَلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَى غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا

مَنْ أَمَرَ تَضَىٰ مَنْ رَّسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ

يَدَايِهِا وَمِنْ خَلْفِهَا مَصَدًّا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ
اَبْلَغُوا بِرِسَالَتِي مَا بَيْنَهُمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ
وَاَحْصَى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔

(الحج - ۲)

”وہ (اللہ) غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب
پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اس رسول کے جس کو اس نے
پسند کیا ہو، پھر وہ اس کے گرد و پیش نگران فرشتے لگا دیتا
ہے تاکہ یہ اطمینان کرے کہ پیغام پہنچانے والوں نے اپنے
رب کے پیغامات ٹھیک ٹھیک پہنچا دیئے اور اللہ تعالیٰ اُن
کے اوپر محیط ہے اور ہر چیز کا شمار کرتا ہے۔“

نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ۔

(النمل - ۱۳)

”اسے رُوح القدس (پاکیزگی کی رُوح) نے تیرے رب
کی طرف سے ٹھیک ٹھیک نازل کیا ہے۔“

اِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِرُوحِ
الْاَمِينِ۔ (الشعراء - ۱۰)

”بے شک یہ رب العالمین کی نازل کردہ کتاب ہے۔“

جسے کہ رُوح الامین (امانت دار رُوح) اترا ہے۔“

اِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِيْ كِتَابٍ مَّكْنُوْنٍ لَا
يَمَسُّهَا اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ تَنْزِيلٌ مِّنْ رَبِّ
الْعَالَمِيْنَ۔ (الواقعه - ۳)

”بالیقین یہ معزز قرآن ہے، ایک پوشیدہ نوشتہ میں
لکھا ہوا، اس کو پاک (فرشتوں) کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا،

نازل کیا ہو اور رب العلمین کی طرف سے یہ

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالملائکہ صرف ایمان باللہ ہی کے لئے نہیں بلکہ ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسول کے لئے بھی ضروری ہے۔ ملائکہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُس ذریعے کو قابلِ اعتماد تسلیم کریں جس سے خدا کا پیغام اُس کے رسولوں تک پہنچا ہے اُس پیغام پر اور اس کے پیش کرنے والے رسولوں پر ہمارا اعتماد مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اُس درمیانی واسطے پر بھی ہم پوری طرح اعتماد نہ کریں جو خدا اور اس کے رسولوں کے مابین کام کرتا رہا ہے

تیسرا مقصد

اس کے علاوہ ملائکہ کی ایک اور حیثیت بھی قرآن مجید میں بیان کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سلطنت کے کارندے ہیں۔ ساری کائنات کا انتظام اپنے جن ملازموں سے اللہ تعالیٰ کرا رہا ہے وہ ملائکہ ہی ہیں اللہ کی سلطنت میں ان کا مقام گویا وہی ہے جو دنیا کی حکومتوں میں ان کی ملازمتوں (Services) کا ہوتا ہے انہی کے ذریعے سے وہ کسی پر عذاب نازل کرتا ہے اور کسی پر رحمت۔ کسی کی روح قبض کرتا ہے اور کسی کو زندگی بخشا ہے۔ کسی جگہ بارش برساتا ہے اور کہیں قحط ڈلوادیتا ہے۔ وہ ہر انسان کے اعمال، اقوال اور خیالات تک کا پورا ریکارڈ رکھ رہے ہیں اور ایک ایک جنبش کی نگرانی کر رہے ہیں۔ آدمی جب تک خدا کی دی ہوئی مہلت کے اندر کام کر رہا ہے، یہ تمام کارکن اس کی ساری بُری بھلی باتوں سے واقف ہونے کے باوجود، امر الہی کے تحت اس کے ساتھ تعاون کرتے رہتے ہیں اور اس کے سارے کام بنائے چلے جاتے ہیں۔ مگر جو نہی کہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوئی، پھر وہی

خادم اس کو گرفتار کر لیتے ہیں جو ایک لمحہ پہلے تک اس کی خلافت کا کارخانہ چلا رہے تھے۔ وہی ہوا جس کے بل پر آدمی جی رہا تھا، یکایک اس کی بستیوں کو الٹ دیتی ہے۔ وہی پانی جس کا سینہ آدمی چیرتا پھر رہا تھا، اچانک اسے غرق کر دیتا ہے۔ وہی زمین جس پر آدمی ماں کی گود جیسے اطمینان کے ساتھ بس رہا تھا، یک لخت ایک جھٹکے میں اسے پیوندِ خاک کر دیتی ہے۔ ایک حکم کی دیر ہے، اور اس کے آتے ہی خلیفہ صاحب کا قریب ترین اردلی ان کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے۔ یہ نقشہ قرآن مجید میں جگہ جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

اس لحاظ سے ایمان بالملائکہ، ایمان باللہ کا ایک لازمی جز ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی سلطانِ کائنات کے ساتھ ساتھ اسکی ملازمتوں کو بھی تسلیم کرے۔ اس کے بغیر اس سلطنت میں آدمی نہ اپنی پوزیشن صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ اُس پوزیشن کا پورا شعور رکھتے ہوئے کام کر سکتا ہے۔

ایمان بالرسول

حقیقت رسالت

توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ ”رسالت“ ہے جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے اسی طرح اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے لغوی معنی پیامبری کے ہیں۔ جو شخص کسی کا پیغام کسی دوسرے شخص کے پاس پہنچائے وہ ”رسول“ ہے۔ مگر اسلام کی اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے، اور خدا کے حکم سے راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ اسی لئے قرآن میں رسول کے لئے ”ہادی“ کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، یعنی وہ جو سیدھا راستہ دکھائے۔

خدا نے ایک رہبر تو انسان کے اپنے نفس میں مقرر کر رکھا ہے جو الہام الہی کی بنا پر اچھے اور بُرے خیالات، غلط اور صحیح اعمال کے درمیان تمیز کر کے انسان کو فکر و عمل کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے، جیسا کہ فرمایا وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْنَاهَا فَأَلْهَمْنَاهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ نَزَّلَهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا۔ (الشمس)۔ لیکن چونکہ اس رہنما کی ہدایت واضح نہیں ہے، اور اس کے ساتھ بہت سی ذہنی اور خارجی قوتیں ایسی بھی لگی ہوئی ہیں جو انسان کو بُرے اعمال کی طرف کھینچتی رہتی ہیں، اور ان وجوہ سے تنہا اس جلی رہنما کی ہدایت بے شمار ٹیڑھے راستوں میں سے حق کی سیدھی راہ نکال لینے

اور اس پر بے خطر چلنے میں انسان کے لیے کافی نہیں ہو سکتی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے خارج سے اس کی کو پورا کیا اور انسان کی طرف اپنے پیغامبر بھیجے تاکہ وہ علم و معرفت کی روشنی سے اس باطنی رہنما کی امداد کریں، اور اُس مبہم فطری الہام کو آیات و بینات کے ذریعہ سے واضح کر دیں جس کی روشنی جہالتوں اور گمراہ کن قوتوں کے بھوم میں مدہم پڑ جاتی ہے۔

یہی منصب رسالت کی اصل ہے جو لوگ اس منصب پر سرفراز کیے گئے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیر معمولی علم اور نور بصیرت عطا کیا گیا ہے جس سے وہ ظن و تخمین کی بنا پر نہیں بلکہ علم یقین کی بنا پر ان امور کی حقیقت جان گئے ہیں جن میں عامۃ الناس اختلاف کرتے ہیں اور اس نور بصیرت سے انہوں نے ٹیڑھے راستوں میں سے حق کا سیدھا اور صاف راستہ دیکھ لیا ہے۔

رسول اور عام رہنماؤں کا فرق

خارجی رہنما کی ضرورت ہر زمانہ میں انسان نے تسلیم کی ہے۔ کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ انسان کے لیے محض اس کے اپنے باطنی رہنما کی ہدایت کافی ہے۔ آباؤ اجداد، خاندان، اور قبیلے اور قوم کے بزرگ، اساتذہ، اہل علم، مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈر، اجتماعی مصلحین اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کو جن کی دانشمندی پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا، ہمیشہ رہنمائی کا منصب دیا گیا ہے اور ان کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن جو چیز ایک رسول کو ان دوسری قسم کے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ ”علم“ ہے۔ دوسرے رہنماؤں کے پاس علم نہیں ہے۔ وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں اور اس رائے میں ہوائے نفس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے

ہیں۔ اس لیے جو عقائد و قوانین وہ وضع کرتے ہیں ان کے اندر حق اور باطل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ پورا پورا حق اُن کے قائم کیے ہوئے طریقوں میں نہیں ہوتا۔ اسی حقیقت پر قرآن مجید بار بار متنبہ کرتا ہے۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ۔

(النجم - ۱)

”وہ جس چیز کی پیروی کرتے ہیں وہ بھڑمان اور خواہشاتِ نفس کے اور کچھ نہیں ہے۔“

وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ
وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (النجم - ۲)

”اور ان کے پاس حقیقت کا کوئی علم نہیں ہے۔ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔“

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَ هُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

(الروم - ۳)

”مگر ظالموں نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو۔“

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا
هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُنِيرٍ إِنَّا نَعْلَمُ لِمَ يَصِفُكَ عَنْ سَبِيلِ
اللَّهِ۔ (الحج - ۱)

”اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو تکبر کے ساتھ منہ موڑے ہو۔ اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم و ہدایت اور کتابِ منیر کے جھگڑتا ہے تاکہ اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے۔“

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ

اللَّهِ۔ (القصص - ۵)

”اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جس نے اللہ کی طرف

سے آئی ہوئی ہدایت کے بجائے اپنی خواہش کا اتباع کیا۔“

بخلاف اس کے رسول کو اللہ کی طرف سے ”علم“ عطا کیا جاتا ہے۔ اس کی رہنمائی گمان اور ہوائے نفس کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ وہ خدا کے بخشے ہوئے نورِ علم سے جس سیدھے رستے کو صاف اور واضح دیکھتا ہے اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں کہیں انبیاء علیہم السلام کو ”رسالت“ کے منصب پر سرفراز کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں یہی کہا جاتا ہے کہ ان کو ”علم“ بخشا گیا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ سے نبوت کا اعلان اس طرح کرایا جاتا ہے:-

يَا بَتِّ اِنِّیْ قَدْ جَاۤءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ

یَاۤتِکَ فَاتَّبِعْنِیْ اَھْدِکَ صِرَاطًا سَوِیًّا۔

(مریم - ۳)

”اے پدیر عزیز یقین جان کہ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو

تیرے پاس نہیں آیا، لہذا تو میری پیروی کر میں تجھے سیدھے راستہ

پر چلاؤں گا۔“

لوط علیہ السلام کو نبوت بخشنے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے:-

وَلُوطًا اَتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (الانبیاء - ۵)

”اور لوطؑ کو ہم نے قوتِ فیصلہ اور علم بخشا۔“

حضرت موسیٰؑ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّاهُ وَاسْتَوٰی اَتَيْنَاهُ حُكْمًا

وَعِلْمًا۔ (القصص - ۲)

”اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا

تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا۔“

داؤد و سلیمان علیہما السلام کے نبوت پر سرفراز ہونے کا ذکر بھی اسی طرح کیا جاتا ہے۔

وَكَلَّا أَتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا۔ (الانبیاء۔ ۶)

”ان میں سے ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا۔“

نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے۔

وَلَمَّا أَتَيْنَا أَهْوَأَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ۔

(البقرہ۔ ۱۲)

”اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے ان

کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ سے تم کو بچانے والا کوئی حامی

و مددگار نہ ہوگا۔“

منصب رسالت، اور عام رہنماؤں کے مقابلہ میں رسول کے امتیازی مقام کی توضیح کے بعد اب ہمیں اُن اصولی امور کے طرف توجہ کرنی چاہیے جو رسالت کے بارے میں قرآن مجید نے پیش کیے ہیں۔

ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا تعلق

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب رسول کے پاس علم کا ایسا ذریعہ ہے جو لوگوں کو حاصل نہیں ہے، اور خدا کی طرف سے اس کو بصیرت کا وہ نور عطا کیا گیا ہے جس سے عام انسان محروم ہیں، تو خدا کے بارے میں صرف وہی اعتقاد صحیح ہو سکتا ہے جو رسول نے پیش کیا ہے۔ اگر کوئی شخص خود اپنے غور و فکر یا دوسرے عقلاء و

حکماء کی تعلیمات پر کوئی اعتقاد قائم کرے تو نہ صرف خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ درست نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ان دوسرے امور اور ان طبیعت کے بارے میں بھی کوئی سچی واقفیت بہم نہیں پہنچا سکتا جو دین کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور عام انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ پس جملہ ایمانیات اور معتقدات کی صحت کا کلی انحصار ایمان بالرسول پر ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم اس واسطہ سے قطع تعلق کر کے علم صحیح سے دامن فکر کو وابستہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان بالرسول پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

وَكَايَتُنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهَا
فَحَاسِبْنَآ هَآ حِسَابًا شَدِيدًا وَعَذَابْنَهَا عَذَابًا
تَّكْرًا فَذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا
نُحُورًا۔ (الطلاق- ۲)

”اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی توہم نے ان سے سخت حساب لیا اور انہیں بڑی بڑی سزا دی۔ جس سے انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور آخر کار ان کا انجام نامرادی رہا۔“

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ
أَنْ يُفْرِقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ
بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا
بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا، وَالَّذِينَ آمَنُوا
بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفْرِقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ

أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمُ أَجُورُهُمْ وَكَانَ اللَّهُ
غَفُورًا رَحِيمًا۔ (النساء۔ ۲۲)

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور
اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم
بعض کو مانیں گے اور بعض سے انکار کریں گے۔ اور چاہتے ہیں
کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکال لیں، وہ یقیناً کافر ہیں۔ اور
کافروں کے لئے ہم نے ایک رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور
جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور ان میں
سے کسی کے درمیان انہوں نے تفریق نہ کی ان کو عنقریب اللہ تعالیٰ
ان کے اجر عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے
والا ہے۔“

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ
نُؤَلِّهِمْ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔
(النساء۔ ۱۷)

”اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول سے
جھگڑا کرے اور ایمان لانے والوں کے راستے کو چھوڑ کر کسی
اور راستے پر چلے اس کو ہم اسی راستے پر پھیر دیں گے جس پر وہ
خود پھر گیا ہے اور آخر کار اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور یہ
بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔“

یہ اور ایسی ہی سینکڑوں آیات ہیں جن میں صاف صاف
کہا گیا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا تعلق ناقابل انقطاع
ہے۔ جو شخص خدا کے رسولوں کا انکار کرتا ہے، اور ان کی تعلیم کو

قبول نہیں کرتا، وہ چاہے خدا کو مانے یا نہ مانے دونوں حالتوں میں اس کی گمراہی یکساں ہے، کیونکہ خدا کے بارے میں جو اعتقاد علم کے بغیر قائم کیا جائے گا وہ ہرگز صحیح نہ ہوگا، خواہ وہ عقیدہ توحید ہی کیوں نہ ہو۔

وحدت کلمہ

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ صرف ایمان بالرسول ہی وہ چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ایک عقیدہ پر جمع کر سکتی ہے۔ اختلاف کی بنا دراصل جہالت ہے۔ لوگ جس چیز کی حقیقت سے واقف نہ ہوں گے اس کے متعلق گمان کی بنا پر قیاس آرائیاں کریں گے اور لامحالہ ان کے درمیان اختلاف رائے ہوگا کیوں کہ گمان اور قیاس کی مدد سے رائے قائم کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے میں ٹٹولنا۔

جہاں روشنی نہ ہوگی وہاں پچاس آدمی ایک چیز کو ٹٹول کر پچاس مختلف رائیں ظاہر کریں گے۔ مگر روشنی آنے کے بعد کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا اور سب آنکھوں والے ایک ہی نتیجہ پر متفق ہو جائیں گے۔ پس جب انبیاء علیہم السلام کو ”علم“ کی نعمت اور بصیرت کے نور سے بہرہ ور کیا گیا ہے تو ممکن نہیں ہے کہ ان کی آراء میں اختلاف ہو، ان کی تعلیمات میں اختلاف ہو یا ان کے طریقوں میں اختلاف ہو۔ اس لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی گروہ ہیں، سب کی تعلیم ایک ہے، سب کا دین ایک ہے، سب ایک ہی صراطِ مستقیم کی طرف بلانے والے ہیں اور مومن کے لئے سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو شخص انبیاء میں سے کسی ایک نبی کی بھی تکذیب کرے گا وہ گویا تمام انبیاء کی تکذیب کا مجرم ہوگا اور

اس کے دل میں ایمان باقی نہ رہے گا۔ کیوں کہ جس تعلیم کو وہ جھٹلا رہا ہے وہ محض اس ایک نبی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ بجنسہ وہی تعلیم تمام انبیاء کی ہے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهَا فَاغْلَبَ وَكُن مِّنَ الْمُذْذَبِينَ
وَإِن هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ فَتَقَطُّ عَنَّا أَعْيُنُهُمْ فَيَلْوَنُوا
بَيْنَهُمْ شَرِبُوا كُلُّهُمْ شَرِبًا فَتَقَطُّ عَنَّا أَعْيُنُهُمْ فَيَلْوَنُوا
(المومنون - ۲۰)

”خدا نے پیغمبروں سے فرمایا کہ (اے پیغمبرو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں اور یقیناً تمہارا گروہ دراصل ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں، پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ مگر بعد میں لوگوں نے آپس میں اختلاف کر کے اپنے مذہب الگ الگ بنائے، اور اب حال یہ ہے کہ جس گروہ کے پاس جو چیز ہے اسی پر وہ خوش ہے۔“

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا

(النساء - ۲۳)

”اے محمد! ہم نے اُسی طرح تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح

ہم نوحؑ اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیج چکے ہیں، اور اسی طرح ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحقؑ اور یعقوبؑ اور اکی یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی۔ اور ہم ہی نے وہ رسول بھی بھیجے جن کا حال ہم اس سے پہلے تم کو بتا چکے ہیں اور وہ رسول بھی جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا اور تم سے پہلے اللہ تعالیٰ موسیٰؑ سے بھی کلام کر چکا ہے۔“

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات ظاہر کرتی ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی دین حق کی طرف بلاتے آئے ہیں اور وہ ہر قوم کی طرف بھیجے جا چکے ہیں۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (یونس۔ ۵) وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔ (الرعد۔ ۱) ان میں سے جن نبیوں کا ذکر قرآن مجید میں تصریح کیساتھ کیا گیا ہے ان پر تو تصریح کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ رہے وہ انبیاء و ہادیان امم جن کے نام ہمیں نہیں بتائے گئے ہیں تو ان کے متعلق صحیح اعتقاد یہ ہے کہ وہ سب اسلام ہی کے داعی تھے مگر قوموں نے ان کی تعلیمات کو بدل دیا اور آپس میں اختلاف کر کے اپنے الگ الگ مذہب بنالئے۔ ہم بودھ اور کرشن اور زرتشت اور کنفیوشس وغیرہم کو بنی اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ان کے متعلق قرآن میں تصریح نہیں ہے۔ لیکن ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ہندوستان، چین، جاپان، ایران، افریقہ، یورپ اور تمام ممالک میں آئے ہیں، اور سب نے اسی اسلام کی طرف دعوت دی ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں۔ پس ہم کسی قوم کے پیشوا یا مذہب کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ اُن غلط طریقوں کی تکذیب کرتے ہیں جو اب اسلام کی صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

انبیاء کے متعلق قرآن کی یہ تعلیم بے نظیر ہے۔ کسی مذہب میں ایسی تعلیم موجود نہیں ہے۔ یہ صداقت قرآنی کی روشن دلیل ہے اور بنی نوع انسانی کے لئے اس میں عالمگیر اتفاق اور وحدت کلمہ کا ایک سکون بخش پیغام مضمر ہے۔

اتباع و اطاعت رسول

رسالت کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف عقائد اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام عملی مسائل میں بھی اُس طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسول چلے ہیں۔ کیونکہ خدا نے جس ”علم“ اور نور بصیرت سے ان کو بہرہ ور فرمایا تھا اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقینی طور پر انہیں معلوم ہو جاتا تھا، اس لئے وہ جو کچھ ترک یا اختیار کرتے تھے اور جو کچھ حکم دیتے تھے وہ سب خدا کی طرف سے تھا۔ عام انسان سا اہل سال بلکہ قرنہا قرن کے تجربات کے بعد بھی غلط اور صحیح کے امتیاز میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔ اور جو تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہو بھی جاتی ہے تو وہ یقین کامل کی ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بناء محض قیاس و استقراء پر ہوتی ہے جس میں بہر حال غلطی کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام نے زندگی کے معاملات میں جو طریقے اختیار کیے اور جن پر چلنے کی تعلیم دی وہ ”علم“ کی بناء پر اختیار کیے گئے تھے، اس لئے ان میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار انبیاء کی اطاعت اور ان کے اتباع کا حکم دیتا ہے، ان کے قائم کیے ہوئے طریقے کو شریعت اور مہناج اور صراطِ مستقیم کہتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ تمام دوسرے لوگوں کا اتباع ترک کر کے صرف انبیاء کا اتباع کرو اور انہی کے طریقے پر چلو، کیونکہ ان کی اطاعت عین

خُدا کی اطاعت ہے، اور ان کا اتباع عین مرضاتِ الہی کا اتباع۔
 وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ
 اللہ۔ (النساء۔ ۹)

”اودھیم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ بحکم
 خدا اس کی اطاعت کی جائے۔“

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔ (النساء۔ ۱۱)
 ”جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے خدا کی اطاعت کی۔“
 قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ
 اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔
 قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ
 لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ۔ (آل عمران۔ ۳)

”اے محمد! کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا
 اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا،
 اللہ بخشنے والا اور نہ رنے والا ہے۔ کہو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت
 کرو۔ پھر اگر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند
 نہیں کرتا۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ
 وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ وَلَا تَكُونُوا
 كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ۔ إِنَّ شَرَّ
 الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا
 يَعْقِلُونَ۔ (الأنفال۔ ۳)

”اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت
 کرو اور اس سے ہرگز روگردانی نہ کرو جب کہ تم اس کا حکم سن چکے

ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سُن لیا
حالانکہ وہ کچھ نہیں سنتے۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ ہے جو گونگے
ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے۔

وَمَا كَانَ لِلْمُؤْمِنِ وَلَا الْمُؤْمِنَةِ إِذَا قَضَى اللَّهُ
وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا
(الاحزاب۔ ۵)

”کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لئے درست نہیں ہے کہ
جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو اُن کے لئے
اپنے معاملے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور جس
نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔“
فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ
أَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هُؤُلَاءَ بِغَيْرِ
هُدًى مِنَ اللَّهِ۔ (القصص۔ ۵)

”پھر اگر وہ تیری بات نہ مانیں تو جان لے کہ وہ محض اپنی
خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس شخص سے زیادہ گمراہ
کون ہوگا جس نے خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی
کے۔“

ایسی اور بیسیوں آیات ہیں جن میں اتباع و اطاعتِ رسول پر
زور دیا گیا ہے۔ پھر سورۃ احزاب میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے
کہ رسول اللہ کی زندگی ان لوگوں کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے جو
اللہ سے بخشش کی اور یومِ آخر میں کامیابی کی اُمید رکھتے ہیں۔ لَقَدْ
كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهُ كَثِيرًا۔ (رکوع-۳)

عقیدہ رسالت کی اہمیت

اطاعت و اتباع کے ان احکام کے ساتھ رسالت کا عقیدہ در حقیقت اُس تہذیب کی جان، اس کی روح حیات اور قوت بقاء، اور اس کے امتیازی خصائص کی بنائے اصلی ہے جسے اسلام نے قائم کیا ہے۔

ہر تہذیب اور نظام تمدن میں تین چیزیں اساس کا حکم رکھتی ہیں، ایک طریق فکر، دوسرے اصول اخلاق اور تیسرے قوانین مدنی۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ تینوں چیزیں تین مختلف ذرائع سے آتی ہیں۔ طریق فکر اُن مفکرین اور اہل حکمت کی تعلیمات سے ماخوذ ہوتا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے بڑے بڑے انسانی گروہوں کی ذہنیت پر قابو پا لیا ہے۔ اصول اخلاق ان رہنماؤں، مصلحوں، اور پیشواؤں سے لئے جاتے ہیں جن کو مختلف زمانوں میں خاص خاص قوموں پر اقتدار حاصل ہوا ہے۔ اور قوانین مدنی کے وضع کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی جہارت پر زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتماد کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے جو نظام تمدن قائم ہوتا ہے۔ اس میں لازمی طور پر تین بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ ان تین مختلف ذرائع سے جو عناصر فراہم ہوتے ہیں ان سے ایک ایسی معجون مرکب تیار ہوتی ہے جس کا مزاج کہیں صدیوں میں جا کر قائم ہوتا ہے، اور پھر بہت سی بے ربطیاں، بے اعتدالیاں اور نامناسبیتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ مفکرین اور اہل حکمت بہت سے ہیں۔ سب کے طریق فکر جدا جدا اور ایک دوسرے سے اصلاً مختلف ہیں۔ عموماً وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو کبھی انسانی زندگی کے عملی

مسائل سے کسی قسم کا مس نہیں رہا ہے، بلکہ ان میں سے اکثر اپنی مردم
 بیزاری کے لئے مشہور رہے ہیں۔ اس ماخذ سے اہل دنیا اپنا طریق فکر
 حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا عنصر جس گروہ سے لیا جاتا ہے۔ اس میں بھی
 انفرادی تخیلات و افکار اور ذہنیتوں کے اعتبار سے کافی اختلاف پایا
 جاتا ہے، اور اگر اس گروہ میں کوئی شے مشترک ہے تو وہ صرف یہ ہے
 کہ اس کے تمام افراد تخیل کی دنیا میں رہنے والے اور پُر جوش
 جذباتی لوگ ہوتے ہیں جو ٹھوس عملی مسائل سے بہت ہی کم تعلق
 رکھتے ہیں۔ رہا تیسرا عنصر تو اس کے ماخذ بھی باہم مختلف ہیں اور
 ان میں یہ چیز مشترک ہے کہ جذبات لطیف کی ان کے اندر بہت کمی
 ہے، ضرورت سے زیادہ عملیت نے ان کو قسّی القلب اور خشک بنا
 دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے متضاد عناصر میں صحیح اور معتدل امتزاج
 قائم ہونا بہت مشکل ہے اور ان کا تضاد اپنا رنگ نمایاں کیے بغیر
 نہیں رہ سکتا۔

۲۔ ان ذرائع سے جو عناصر ثلاثہ حاصل ہوتے ہیں ان میں نہ
 طول حیات کی قوت ہوتی ہے، نہ توسع کی استعداد۔ مختلف قوموں
 پر مختلف مفکروں، رہنماؤں اور مقتنوں کے اثرات پڑتے ہیں، اور
 ان کی وجہ سے ان کے طریقہائے فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی
 میں اصولی اختلافات واقع ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک قوم پر بھی تمام
 زمانوں میں انہی مخصوص مفکروں، رہنماؤں اور مقتنوں کا اثر قائم نہیں رہتا
 جنہوں نے ابتداء میں اس پر اثر ڈالا تھا، بلکہ اختلاف زمانہ کے ساتھ یہ
 مؤثر اور ان کے اثرات بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح تہذیبیں ایک
 طرف تو قومی بن جاتی ہیں، اور ان کے اختلاف سے قومیتوں کا وہ اختلاف
 برانگیختہ ہوتا ہے جو دراصل خرمین امن کو پھونک دینے والی بجلی کا بیرونی

ہے۔ دوسری طرف ہر قوم میں بھی بجائے خود تہذیب و تمدن کا نظام
دائماً ایک سیمائی کیفیت میں رہتا ہے اور اس میں ایک خط مستقیم پر
نشوونما ہونے کے بجائے ہمیشہ اساسی تغیرات واقع ہوتے رہتے
ہیں جن کا میلان کبھی ارتقاء کی جانب ہوتا ہے اور کبھی انقلاب کی
جانب۔

۳۔ عناصر ثلاثہ کے ان مبادی میں سے کسی میں بھی تقدس کا شائبہ
نہیں ہوتا۔ قوم اپنے مفکرین سے جو طریق فکر، رہنماؤں سے جو اصول
اخلاق اور واضعین قانون سے جو قوانین مدنی لیتی ہے وہ سب انسانی
اجتہاد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور اُن کے نتیجہ اجتہاد انسانی ہونے کا
خود اُن کے متبعین کو بھی احساس رہتا ہے۔ اس کا لازمی اثر یہ ہے
کہ اتباع کبھی کامل نہیں ہوتا۔ متبعین اپنے انتہائی اتباع کی حالت میں
بھی ایمانی کیفیت سے متکیف نہیں ہونے پاتے۔ وہ خود یہ سمجھتے ہیں
کہ اُن کی تہذیب کے عناصر اصلیہ میں غلطی کا امکان اور اصلاح کی
ضرورت ہے۔ پھر تجربات بھی رفتہ رفتہ ان کی غلطیاں ثابت کرتے رہتے
ہیں جن سے شک اور تذبذب کی حالت ہونا ہو جاتی ہے اس طرح
کبھی کسی طریق فکر یا اصول قانون کو قوم پر اپنی پوری گرفت قائم
کرنے اور نظام تمدن کو مستحکم کر دینے کا موقع نہیں ملتا۔

ایمان بالرسول کی بنیاد پر جو تہذیب قائم ہوتی ہے وہ ان تینوں
خوابیوں سے پاک ہوا کرتی ہے۔

اولاً اس میں تہذیب کے تینوں عنصر ایک ہی مبتدا سے آتے
ہیں۔ ایک ہی شخص طریق فکر بھی مقرر کرتا ہے، اصول اخلاق بھی متعین
کرتا ہے اور قوانین مدنی کے اصول بھی وضع کرتا ہے۔ وہ بیک وقت
دنیا کے فکر، عالم اخلاق اور جہان عمل تینوں کا صدر انجمن ہوتا ہے۔

تینوں کے مسائل پر اس کی نظریکساں رہتی ہے۔ اس میں تفکر، جذبات، لطیف اور حکمت عملی تینوں کی ایک معتدل آمیزش ہوتی ہے۔ اور ان تینوں عنصروں میں سے ہر ایک کی مناسب مقدار لے کر وہ تہذیب کے مرکب میں اس طرح شامل کر دیتا ہے کہ کسی چیز میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اجزاء میں کوئی یا ہم بے ربطی اور نامناسبیت نہیں پائی جاتی، اور مرکب کا مزاج غایت درجہ معتدل ہوتا ہے۔ یہ امر درحقیقت انسان کی استطاعت سے بالاتر ہے۔ فاطر کائنات کی ہدایت کے بغیر اس کا انجام پانا کسی طرح ممکن نہیں۔

ثانیاً اس میں کوئی عنصر قومی یا زمانی نہیں ہوتا۔ خدا کا رسول جو طریق فکر، جو اصول اخلاق اور اصول قانون مقرر کرتا ہے وہ قومی رجحانات یا زمانی خصوصیات پر نہیں بلکہ صداقت اور حق پر مبنی ہوتے ہیں اور حق و صداقت وہ شے ہے جو مشرق اور مغرب، سیاہ اور سپید، سامی اور آریں، قدیم اور جدید کے جملہ قیود سے بالاتر ہے۔ جو چیز سچی اور برحق ہے وہ دنیا کے ہر گوشے، دنیا کی ہر قوم، اور وقت و زمانہ کی ہر گردش میں یکساں سچی اور برحق ہے۔ آفتاب جاپان میں بھی آفتاب ہے اور جبل الطارق میں بھی۔ ہزار برس پہلے بھی آفتاب تھا اور ہزار برس بعد بھی آفتاب ہی رہے گا۔ پس اگر کوئی تہذیب عالمگیر، بشری اور دائمی تہذیب بن سکتی ہے تو وہ رسول خدا کی قائم کی ہوئی تہذیب ہی ہے، اور اسی میں یہ قابلیت موجود ہے کہ اپنے اصول و اساس کو بدلے بغیر ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے مناسب حال ہو سکتی ہے۔

ثالثاً یہ تہذیب پوری تقدس کی شان لیے ہوئے ہے۔ اس کا متبع یہ اعتقاد بلکہ ایمان رکھتا ہے کہ جس نے اس تہذیب کو قائم کیا

ہے وہ خدا کا رسول ہے۔ اس کے پاس خدا کا بخشا ہوا علم ہے، اس کے علم میں شک کا شائبہ تک نہیں۔ (لَا مَرِيبَ فِيْهِ)، اس کے باتوں میں نہ ظن و تخمین کو دخل ہے اور نہ ہوائے نفس کو، وہ جو کچھ پیش کرتا ہے خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے، اس کے بھٹک جانے اور غلط راستوں پر چل نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحٰیؕ يُوحٰی عَلَمًا شَدِيْدًا الْقَوٰی۔ (النجم-۱) یہ یقین و ایمان جب متبع رسول کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے تو وہ پورے اطمینان قلب کے ساتھ رسول کا اتباع کرتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی شک اور تذبذب نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں یہ اندیشہ کبھی خلیجان پیدا نہیں کرتا کہ شاید یہ طریقہ صحیح نہ ہو، کوئی اور راستہ برحق یا کم از کم اس سے زیادہ بہتر ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی تہذیب غایت درجہ پائیدار ہوگی۔ اس کا اتباع نہایت مضبوط ہوگا۔ اس میں دنیوی تہذیبوں سے زیادہ ڈسپلن پایا جائے گا۔ اس کے طریق فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی میں زیادہ استحکام ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام اسی تہذیب کے معمار تھے۔ صدیوں تک وہ دنیا کے ہر خطے میں اس کے لئے زمین تیار کرتے رہے۔ اور جب زمین پوری طرح تیار ہو گئی تو محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اگر اس کی عمارت مکمل کر دی۔

رسالت محمدیؐ کے امتیازی خصائص

یہاں تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ رسالت کے عام احکام سے متعلق تھا۔ مگر ان کے علاوہ چند امور ایسے بھی ہیں جو خاص طور پر رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بلاشبہ نفس

منصب رسالت کے لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء میں کوئی فرق نہیں ہے، اور قرآن مجید کا صریح فیصلہ ہے کہ رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق جائز نہیں۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ۔ (ابقرہ۔ ۲۰) پس جہاں تک اصول کا تعلق ہے، تمام انبیاء اس میں مشترک ہیں کہ سب کے سب اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، سب کو ”حکم“ اور ”علم“ عطا کیا گیا ہے، سب ایک ہی طراطِ مستقیم کے طرف بلانے والے ہیں، سب بنی نوع انسان کے ہادی و رہنما ہیں، سب کی اطاعت فرض اور سب کی سیرت بنی آدم کے لئے نمونہ تقلید ہے۔ لیکن عملاً اللہ تعالیٰ نے چند امور میں نبی عزری محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز عطا فرمایا ہے۔ اور یہ امتیاز محض سطحی نہیں ہے کہ اس کو ملحوظ رکھنے یا نہ رکھنے کا کوئی اثر نہ ہو، بلکہ درحقیقت اسلام کے نظام دینی میں اس کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے، اور عملاً اسلام کے تمام معتقدات اور قوانین کی بنیاد رسالتِ محمدیؐ کی اسی امتیازی حیثیت پر قائم ہے۔ اس لئے رسالت کے متعلق کسی کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس مخصوص امتیازی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہ لائے۔

پچھلی تہوتوں اور رسالتِ محمدیؐ کا فرق

اس مضمون کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے چند امور ذہن نشین کر لینے ضروری ہیں:-

۱۔ اشاراتِ قرآنی، روایاتِ ماثورہ، اور قیاس عقلی، تینوں سے یہی مستنبط ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہونی چاہیئے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ خَلَا فِيهَا

سَنَدِ نَبِیِّ (فاطر-۳) ”کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں کوئی متناسبہ کرنے والا نہ گزرا ہو۔“ اور یہ ظاہر ہے کہ نوع بشری کی اتنی امتیں دُنیا میں گزر چکی ہیں کہ تاریخ کا علم ان کا احاطہ نہ کر سکا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔ لہذا ہر امت کے لئے اگر ایک رسول بھی آیا ہو تو رسولوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہونی چاہیئے۔ اسی کی تائید بعض احادیث بھی کرتی ہیں۔ جن میں انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تک بتائی گئی ہے۔ لیکن اس حجمِ غفیر میں سے قرآن مجید میں جن انبیاء کے نام بتائے گئے ہیں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ انکے ساتھ اگر ہم ان پیشوایانِ اقوام کو بھی شامل کر لیں جن کی نبوت کے متعلق کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ہے، تب بھی یہ تعداد دھائیوں سے متجاوز نہیں ہوتی۔ اس طرح بے شمار انبیاء کا نام و نشان تک مٹ جانا، اور ان کی تعلیمات کے آثار کا محو ہو جانا، اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی بعثت خاص زمانوں اور خاص خاص قوموں کے لئے ہوئی تھی، اور ان کے پاس کوئی ایسی شے نہ تھی جو ثبات اور دوام بخشنے اور عالمگیر وسعت عطا کرنے کے قابل ہوتی۔

۲۔ پھر جن انبیاء اور پیشوایانِ اقوام کے نام ہم کو معلوم بھی ہیں ان کے حالات اور تعلیمات پر افسانوں اور تحریفات کے لتے پڑے پڑے ہوئے ہیں کہ ان کے متعلق ہمارے علم کو ہمارے جہل سے کوئی نسبت نہیں۔ ان کے جس قدر آثار اس وقت دُنیا میں موجود ہیں۔ انہیں ظنی اعتقاد سے قطع نظر کر کے خالص تاریخی نقد کے معیار پر جانچے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہو۔ ہم ان کا صحیح زمانہ تک متعین نہیں کر سکتے ہم ان کے صحیح ناموں تک سے ناواقف ہیں۔ ہم قطعی طور سے یہ بھی نہیں کہہ

سکتے کہ وہ فی الواقع دُنیا میں موجود بھی تھے یا نہیں۔ بودھ، زردشت، اور مسیح جیسی مشہور ہستیوں کے متعلق بھی مؤرخین نے شک کیا ہے کہ آیا وہ تاریخی ہستیاں ہیں یا محض تخیلی۔ پھر ان کی سیرتوں کے متعلق جو کچھ معلومات ہمارے پاس ہیں۔ اتنی مجمل اور مبہم ہیں کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی ان کو نمونہ تقلید نہیں بنایا جاسکتا۔ اور یہی حال ان کی تعلیمات کا ہے۔ جو کتابیں یا جو تعلیمات ان کی طرف منسوب ہیں ان میں سے کسی کی سند ان تک نہیں پہنچتی، اور نہایت قوی شہادتیں اندرونی اور بیرونی، دونوں قسم کی ایسی موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں میں بکثرت تحریفات ہوئی ہیں۔ یہ اُمور اس امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے انبیاء اور پیشوا گزرے ہیں ان کی رسالت اور پیشوائی ختم ہو چکی ہے۔

۳۔ قریب قریب تمام انبیاء اور پیشواؤں کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ اُن کی تعلیم اُن مخصوص اقوام کے لئے تھی جن میں سے وہ آئے تھے۔ بعض نے خود اس کی تصریح کی، اور بعض کے متعلق واقعات نے اس کو ثابت کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، کنفیوشس، زردشت، اور کرشن کی تعلیم کبھی ان کی قوم کے باہر نہیں گئی یہی حال سامی اور آریں اقوام کے دوسرے رسولوں اور پیشواؤں کا ہے البتہ بودھ اور مسیح کی تعلیم کو ان کے پیروں نے دوسری اقوام تک پہنچایا مگر خود انہوں نے کبھی نہ اس کی کوشش کی، اور نہ یہ کہا کہ ان کا پیغام تمام عالم کے لئے ہے۔ بلکہ مسیح علیہ السلام سے تو خود انجیل میں یہ قول منقول ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے آئے تھے۔

۴۔ تمام انبیاء اور پیشوایانِ اہم میں تہنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

جن کی سیرت اور تعلیم کے متعلق ہمارے پاس اس قدر صحیح، مستند، اور یقینی معلومات موجود ہیں کہ ان کی صحت میں شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کی کسی تاریخی شخصیت کے متعلق آج معلومات کا اتنا صحیح اور قابل اعتماد ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مشکوک اس کی صحت میں شک کرے تو اس کو تمام دنیا کا تاریخی ذخیرہ نذر آتش کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اتنے مستند ذخیرے کی صحت میں شک کرنے کے بعد تو یہ ماننا لازم آتا ہے کہ تاریخ کا پورا علم جھوٹ کا ایک انبار ہے اور اس کے ایک لفظ پر بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۵۔ اسی طرح تمام انبیاء اور پیشواؤں میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی سیرت اور زندگی کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ نہ صرف پیشوایانِ اہم بلکہ دنیا کی تمام تاریخی شخصیتوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جسکی سیرت اتنی جزئی تفصیلات کے ساتھ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو آنحضرت کے عہد اور ہمارے موجودہ عہد میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف اتنا ہے کہ اُس زمانہ میں آنحضرت اپنی حیاتِ جسمانی کے ساتھ موجود تھے، اور اب نہیں ہیں۔ لیکن اگر زندگی کے ساتھ جسمانی زندگی کی قید نہ لگائی جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت آج بھی زندہ ہیں، اور جب تک دنیا میں آپ کی سیرت موجود رہے گی اس وقت تک آپ زندہ رہیں گے۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں دنیا آج بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اتنے ہی قریب سے دیکھ سکتی ہے جتنے قریب سے آپ کے عہد کے لوگ دیکھ سکتے تھے۔ پس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ انبیاء اور پیشوایانِ ادیان میں سے اگر کسی کا صحیح اور مکمل طور پر اتباع

کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۴۔ یہی حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انبیاء اور پیشواؤں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی لائی ہوئی کتاب، اور جسکی پیش کی ہوئی تعلیم آج اپنی صحیح شکل میں موجود ہو، اور قابل یقین و اعتماد طریقے سے اپنے لانے والے اور پیش کرنے والے کی طرف منسوب کی جاسکتی ہو۔ یہ شرف تنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب، قرآن، بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ موجود ہے جن الفاظ میں آنحضرت نے اس کو پیش کیا تھا۔ اور قرآن کے علاوہ جو ہدایات آپ نے اپنی زبان وحی ترجمان سے دی تھیں، وہ بھی قریب قریب اپنی صحیح صورت میں آج تک محفوظ ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔ پس رسولوں اور پیشواؤں میں سے اگر کسی کی تعلیم کا اتباع یقینی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے تو وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

۵۔ پچھلے زمانے کے انبیاء اور پیشواؤں کی تعلیم اور سیرت کے متعلق جو ذخیرہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس سب پر نظر ڈال جائیے۔ اس میں حق اور صداقت، خیر اور صلاح، حسن اخلاق اور حسن معاملات کے جتنے پاکیزہ نمونے آپ کو ملیں گے وہ سب کے سب آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی سیرت میں پاسکتے ہیں اسی طرح آپ کے بعد نوع بشری کے جتنے رہنما پیدا ہوئے ہیں ان کی تعلیم اور سیرت میں بھی آپ کو ایسی کوئی چیز نہ ملے گی جو حق اور صدق، نیکی اور بہتری ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سیرت میں موجود نہ ہو۔ پھر آنحضرت کی تعلیم اور سیرت میں آپ کو علم حق، عمل صالح، اور اصول خیر کا ایک وافر ذخیرہ ایسا بھی ملے گا جو دنیا کے کسی اگلے اور

پچھلے پیشوا کی تعلیم اور سیرت میں نہیں پایا جاتا۔ ان سب پر مزید یہ کہ علم الہی اور اخلاق و معاملات دنیوی کے متعلق کوئی ایسی صحیح بات انسان سوچ نہیں سکتا جو اسلام سے باہر ہو۔ پس یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور سیرت تمام خیرات کی جامع ہے۔ حق جو کچھ تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر کر دیا۔ صراطِ مستقیم جس چیز کا نام تھا وہ آپ نے روشن کر کے کر کے دکھا دی۔ جملہ انفرادی اور اجتماعی حیثیات سے انسان کے اخلاق اور معاملات کو درست رکھنے اور دنیا میں صحیح طور پر زندگی بسر کرنے کے لئے جتنے اصولِ حقہ ہو سکتے تھے وہ سب آپ نے واضح طور پر پیش کر دیئے۔ اب ان پر کسی اضافہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

۸۔ انبیاء اور پیشوا یا ان ادیان کے پورے گروہ میں تنہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کی دعوت تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے، اور عملاً بھی یہی ہوا کہ آپ نے اپنی زندگی میں شاہانِ اقوام کو دعوت نامے بھیجے اور آپ کی دعوت رُوعِ زمین کے ہر گوشے اور جی آدم کی ہر قوم میں پہنچی۔ یہ خصوصیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ بعض نے تو نہ عالمگیری کا دعویٰ کیا اور نہ ان کو عالمگیری نصیب ہوئی۔ اور بعض کے مذاہب کو عالمگیری تو نصیب ہوئی، مگر خود انہوں نے نہ اس کا کبھی دعویٰ کیا نہ اس کی کوشش کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ایسا اور کوئی نہیں ہے جس نے عالمگیری کا دعویٰ بھی کیا ہو، اس کے لئے کوشش بھی کی ہو، اور جسے بالفعل عالمگیری نصیب بھی ہوئی ہو۔

۹۔ دنیا میں انبیاء کی آمد کے تین ہی سبب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کسی قوم کی ہدایت کے لئے پہلے کوئی نبی نہ آیا ہو اور کُل قوم

ہادیٰ کی بنا پر اس کے لئے ایک نبی یا ایک سے زیادہ انبیاء کی ضرورت ہو۔ دوسرے یہ کہ پہلے کوئی نبی آیا تھا، مگر اس کی رسالت کے آثار محو ہو گئے، اس کی تعلیم اور اس کی لائی ہوئی کتاب میں تحریف ہو گئی، اس کی سیرت کے نشانات اس طرح مٹ گئے کہ لوگوں کے لئے اس کی پیروی کرنا اور اس کے اسوہ حسنہ کی تقلید کرنا ممکن نہ رہا۔ تیسرے یہ کہ پہلے نبی یا انبیاء کی تعلیم اور ہدایت مکمل نہ ہو اور اس میں مزید اضافہ کی ضرورت ہو۔ ان تین اسباب کے سوا انبیاء کی بعثت کا کوئی چوتھا سبب نہ ہے اور نہ عقلاً ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی قوم کے لئے نبی آچکا ہو، اس کی تعلیم اور اس کی سیرت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہو، اس میں کسی اضافہ کی ضرورت بھی نہ ہو، اور پھر اسکے بعد کوئی دوسرا نبی بھیج دیا جائے۔ نبوت کا منصب محض ایک فضیلت نہیں ہے کہ وہ کسی حسن عمل کے صلے میں بطور انعام دیا جاتا ہو، بلکہ وہ ایک خاص خدمت ہے جس پر ایک مخصوص کام کیلئے ضرورت کسی کو مامور کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ منصب اتنا چھوٹا اور ادنیٰ درجہ کا بھی نہیں ہے کہ کسی گزرے ہوئے نبی کی تعلیم کی طرف محض توجہ دلانے کے لئے اسے قائم کیا جائے۔ اس کام کیلئے علمائے حق اور مجددین کی جماعت بالکل کافی ہے۔ بس عقل قطعیت کیساتھ

لے ایک چوتھا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کیلئے دوسرا نبی مبعوث کرنے کی ضرورت ہو، جس کی بعض مثالیں قرآن پاک میں ملتی ہیں۔ لیکن یہاں یہ صورت زیر بحث نہیں ہے، کیوں کہ مددگار نبی کبھی نبوت اس نبوت کا ضمیمہ ہوتی ہے جس کی معیت میں اسے وزیر کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے۔

یہ حکم لگاتی ہے کہ جب تک مندرجہ بالا اسباب ثلاثہ میں سے کوئی سبب داعی نہ ہو کوئی نبی نہیں آ سکتا، اور ہمارے پچھلے بیان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ تینوں دوائی مرتفع ہو چکے ہیں۔ آپ کی دعوت تمام نوع بشری کیلئے ہے، لہذا اب جدا جدا قوموں کے لئے نبی آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کے جملہ آثار رسالت اپنی صحیح شکل میں محفوظ ہیں، لہذا کسی نئی کتاب یا نئی ہدایت کے آنے کی بھی ضرورت نہیں، آپ کی تعلیم اور ہدایت مکمل اور جامع ہے، علم حق میں سے کوئی چیز پوشیدہ رہ گئی ہے اور عمل صالح کیلئے ہدایت اور نمونہ تقلید پیش کرنے میں کوئی کسر باقی ہے، لہذا اس پر کسی اضافہ کرنے والے کی بھی ضرورت نہیں۔ جب یہ تینوں دوائی موجود نہیں ہیں، اور بعثت انبیاء کے دوائی انہی تین میں منحصر ہیں، تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ قطعاً بند ہو چکا ہے۔ اگر اب یہ دروازہ کھلا رہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا فعل عبث بھی کرتا ہے، حالانکہ خدا اس سے پاک اور منزہ ہے کہ اس سے کوئی بے کار فعل صادر ہو۔

۱۔ اور معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بلا ضرورت ایک نبی مبعوث کرنا ایک فعل عبث ہے، بلکہ مزید برآں وہ خلاف حکمت بھی ہے۔ نبوت کے کام کی تکمیل ہو جانے کے بعد تو اس دروازے کو بند ہی ہو جانا چاہیے تاکہ ایک نبی کے اتباع پر ساری دنیا جمع ہو سکے۔ ورنہ اگر یہ دروازہ پھر بھی کھلا رہے تو ہر نئے نبی کی اُمد پر لوگوں میں پھرنے پھرنے سے کفر و ایمان کی تفریق رونما ہوگی اور جمع شدہ لوگ پھر منقسم ہونا شروع ہو جائیں گے۔

رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی وہ امتیازی حیثیات ہیں جن کو قرآن مجید نے پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دعوتِ عام

قرآن کہتا ہے کہ :-

قُلْ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ
جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَٱلْأَرْضِ
لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوٓا۟ بِٱللَّهِ
وَرَسُولِهِ ٱلنَّبِیِّ ٱلْأَقِیِّ ٱلَّذِی یُؤْمِنُ
بِٱللَّهِ وَكَلِمَتِهِ ۚ وَٱتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ۔

(الاعراف۔ ۲۰)

”اے محمد! کہو کہ لوگو میں تم سب کی طرف اس خدا کا بھیجا ہوا
پیغام بر ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے،
جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ کرنے اور مارنے والا
ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے آن پڑھ رسول و نبی پر
جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی
پیروی کرو تاکہ تم سیدھا راستہ پاؤ۔“

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا
وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

(سبا۔ ۳)

”اور اے محمد! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کیلئے خوشخبری
دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، مگر اکثر لوگ اس سے
ناواقف ہیں۔“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ
مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ
لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ - (النساء - ۲۳)

”اے لوگو، تمہارے رب کی طرف سے یہ رسول تمہارے
پاس حق کے ساتھ آیا ہے پس ایمان لاؤ، یہ تمہارے لیے بہتر
ہے اور اگر کفر کرتے ہو تو خوب جان لو کہ اللہ ہی آسمانوں اور
زمین کا مالک ہے۔“

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ -

(الانبیاء - ۷)

”اے محمد! ہم نے تم کو تمام اہل عالم کے لیے رحمت بنا کر

بھیجا ہے۔“

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ
لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا -

”پاک ہے وہ جس نے حق و باطل میں فرق کرنے والی

کتاب اپنے بندے پر اتاری تاکہ تمام اہل عالم کے لیے متنبہ

کرنے والا بنے۔“

اس سے چند امور مستنبط ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کسی زمانے یا کسی قوم
یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ ہمیشہ کے لیے تمام نوع
بشری کے ہادی و رہنما ہیں۔

دوسرے یہ کہ تمام نوع انسانی آپ پر ایمان لانے اور آپ کا
اتباع کرنے کے لیے مکلف ہے۔

تیسرے یہ کہ آپ پر ایمان لائے بغیر اور آپ کا اتباع کیے بغیر

ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

یہ تینوں امور ایمانیات میں داخل ہیں، کیونکہ اسلام جس عالم گیر بشری تہذیب کا نام ہے اس کی عالمگیری اور آفاقیت اسی اعتقاد پر مبنی ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین سے باہر بھی ہدایت میسر آ سکتی ہے تو دعوت اسلام سے اس کی عمومیت سلب ہو جاتی ہے اور اسلام کی عالمگیری ختم۔

مکمل دین

رسالت محمدی کا دوسرا امتیاز جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، یہ

ہے:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ

الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ۔ (التوبہ-۵)

”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کیساتھ

بھیجا تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔“

الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (المائدہ-۱)

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم

پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت جس چیز کا نام ہے، اور دین حق کا

اطلاق جس چیز پر ہوتا ہے وہ تمام و کمال رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

کے ذریعہ سے بھیج دی گئی ہے۔ الدین (یعنی جنس دین) پر آپ کی

رسالت کلیتہً حاوی ہو چکی ہے۔ آپ کے ذریعہ سے دین کو مکمل کر دیا

گیا ہے اور ہدایت کی وہ نعمت جو پہلے انبیاء کے توسط سے تھوڑی

تھوڑی کر کے عطا کی جا رہی تھی، اب اتمام کو پہنچا دی گئی ہے۔ اس

کے بعد ہدایت، اور دین، اور علم حق میں سے کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی ہے جسے ظاہر کرنے کے لیے کسی اور نبی یا رسول کے آنے کی حاجت ہو۔ ان واضح الفاظ کے ساتھ جس تکمیل دین اور اتمام نعمت کا اعلان کیا گیا ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ پچھلی نبوتوں کے ساتھ اطاعت اور اتباع کا تعلق منقطع ہو اور آئندہ کیلئے نبوت کا دروازہ بند ہو جائے۔ یہ دونوں امور یعنی نسخ ادیان سابقہ اور ختم نبوت، رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازی خصائص ہیں اور قرآن مجید میں ان دونوں کو صاف طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔

نسخ ادیان سابقہ

نسخ ادیان سابقہ سے مراد یہ ہے کہ پچھلے انبیاء نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ اب منسوخ ہو گیا۔ ان کی نبوت و صداقت پر اجمالی اعتقاد رکھنا تو ضروری ہے، کیونکہ وہ سب اسلام ہی کے داعی تھے، اور ان کی تصدیق دراصل اسلام ہی کی تصدیق ہے، لیکن عملاً اطاعت اور اتباع کا تعلق اب ان سے منقطع ہو کر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور اسوۂ حسنہ کے ساتھ وابستہ ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ اول تو اصولاً کامل کے بعد ناقص کی ضرورت نہیں رہی، دوسرے انبیاء سابقین کی تعلیم اور سیرت کے آثار تحریف و نسیان کی نذر ہو چکے ہیں، جس کی وجہ سے عملاً ان کا صحیح اتباع ممکن نہیں رہا۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں جہاں کہیں رسول کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ الرسول یا اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مراد ہے، مثلاً أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ۔ (آل عمران - ۱۳) اور أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔ (النساء - ۸) اور مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ

اللہ۔ (النساء۔ ۱۱) پھر یہی وجہ ہے کہ اُن قوموں کو بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور آپ کا اتباع کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو انبیاء سابقین میں سے کسی کے ماننے والی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ
لَكُمْ كَثِيرًا مِمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْقُو
عَنْ كَثِيرٍ، قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ
مُبِينٌ۔ يَهْدِي بِهَا اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ بِرَأْسِهَا
سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى
النُّورِ بِإِذْنِهَا وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔

(المائدہ۔ ۳)

”اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے۔ جو تم سے بہت سی ایسی باتیں بیان کرے گا جن کو تم کتاب میں سے چھپاتے تھے، نیز وہ بہت سی باتوں سے معاف بھی کر دے گا۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کھول کر بیان کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی خوشنودی کا اتباع کریں گے، سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت بخشنے گا اور انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے گا اور سیدھے راستے کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔“

اور۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ
الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ
وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْعُرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُعَلِّمُ لَهُمُ الْطَّيِّبَاتِ وَيُحْزِمُ عَلَيْهِمْ

الْخَبِيثَاتِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي
كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَاَلَّذِينَ آمَنُوا بِهَا وَعَزَّرُوا
وَنَصَرُوا وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ
أُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ، قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي
رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ
فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

(الاعراف-۱۹-۲۰)

”اہل کتاب میں سے ایمان دار وہ ہیں جو اس ان پڑھ رسول
نبی کا اتباع کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور
انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی
سے روکتا ہے، پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے، ناپاک
چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے اُس بوجھ اور اُن سے
بندشوں کو اتار دیتا ہے جو ان پر مسلط تھیں۔ پس جو لوگ اس پر
ایمان لائے اور اس کی حمایت اور امداد کی، اور اُس نور کا اتباع
کیا جو اس کے ساتھ اتارا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔
اے محمد کہہ دے کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا بھیجا
ہوا پیغامبر ہوں جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے،
جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو زندہ کرنے اور مارنے والا
ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے ان پڑھ رسول و نبی پر جو اللہ
اور اس کے کلمات پر ایمان لایا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ
تم سیدھا راستہ پاؤ۔“

ان آیات بینات میں نسخِ ادیانِ سابقہ کی تصریح بھی ہے، اسکے معنی بھی بتا دیئے گئے ہیں، اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی گئی ہے، اسکے منطقی نتائج سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اب ہدایت اور فلاح کا دامن نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اتساع سے وابستہ ہے، اور یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ نبی امی کا دین دراصل اسی دین کی اصلاح اور تکمیل ہے جو تورات اور انجیل کے ماتے والوں اور دنیا کی دوسری قوموں کے پاس بھیجا گیا تھا۔

ختمِ نبوت

اسی طرح تکمیلِ دین کے دوسرے نتیجہ، یعنی ختمِ نبوت کو بھی قرآن مجید میں بالفاظِ صریح بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

عَلِيمًا۔ (الاحزاب-۵)

”محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ

اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر چیز کو جانتے والا

ہے۔“

نبوت کے سدِ باب کا یہ اتنا واضح اور کھلا ہوا اعلان ہے کہ اگر کسی کے دل میں زیرغ اور کجی نہ ہو تو اس اعلان کے بعد وہ اسلام میں نبوت کے فتحِ باب کی گنجائش کسی طرح نہیں نکال سکتا۔ خاتم کو خواہ بتائے مفتوح پڑھیے یا بتائے مکسور، دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ نبوت کا دروازہ اس خدا کے علم میں ہمیشہ کیلئے بند ہو چکا ہے جس کے علم کے خلاف کوئی امر واقع نہیں ہو سکتا۔

عقیدہ رسالت محمدیؐ کے لازمی اجزاء

تکمیل دین، نسخ ادیان سابقہ، اور ختم نبوت کے یہ تینوں عقیدے دراصل اسلام کے ایمانیات میں داخل، اور عقیدہ رسالت محمدیؐ کے لازمی اجزاء ہیں۔ اسلام کی دعوت عام اس بنیاد پر قائم ہے کہ نوع انسانی کے لئے دعوت محمدیؐ کی صورت میں ایک ایسا مکمل مذہب پیش کر دیا گیا ہے جس میں پھلی تمام دعوتوں کی کمی پوری کر دی گئی ہے، اور آئندہ کے لئے کوئی کمی ایسی نہیں چھوڑی گئی جس کو پورا کرنے کی کبھی ضرورت پیش آئے۔ اس مکمل دین نے ہمیشہ کے لئے اسلام اور کفر، حق اور باطل کے درمیان ایسا متعین اور مستقل امتیاز قائم کر دیا ہے کہ اب قیامت تک اس میں کسی قسم کا گٹھاؤ اور بڑھاؤ نہیں ہوگا۔ جو کچھ اسلام اور حق ہے اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کر دیا۔ اب اس جنس کی کوئی مزید چیز آنے والی نہیں ہے کہ آئندہ کسی زمانے میں انسان کا مسلم اور حق پرست ہونا اس نئی چیز کو تسلیم کرنے پر موقوف ہو۔ اور جس چیز کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر اور باطل قرار دے دیا ہے وہ ہمیشہ کے لئے کفر اور باطل ہے، اس میں سے کوئی چیز نہ اب حق اور اسلام ہو سکتی ہے اور نہ اس کے سوا کسی دوسری چیز پر کفر اور اسلام کی نئی تفریق قائم ہو سکتی ہے یہی مٹھوس اور غیر تغیر پذیر بنیاد ہے جس پر عالمگیر اور دائمی ملت و تہذیب اسلامی کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اور اس بنیاد پر اس کی تعمیر اسی لئے کی گئی ہے کہ تمام دنیا کے انسان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہی ملت، ایک ہی دین اور ایک ہی تہذیب کے اتباع پر متفق ہو سکیں۔ ایسی ملت جس کے کامل اور مستقل ہونے کا انہیں پورا یقین ہو، ایسا دین جو حق اور ہدایت پر پوری طرح حاوی ہو حتیٰ کہ اس

جنس کی کسی شے کے اس سے باہر رہ جانے کا اندیشہ نہ رہے، ایسی تہذیب جس کی عمارت میں کفر اور اسلام کی کسی نئی تفریق سے رخنہ پڑ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ اسی اعتماد پر اسلام کی دعوت عام مبنی ہے، اور اسی پر اسلام کے دوام و استحکام کا انحصار ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ اسلام آجانے کے بعد بھی ادیان سابقہ کا اتباع درست ہے وہ دراصل اسلام سے دعوت عام کا حق چھینتا ہے، کیوں کہ جب اسلام کے سوا دوسرے طریقوں سے بھی ہدایت ممکن ہو تو تمام اقوام و ملل کو اسلام کی طرف دعوت دینا ایک فضول حرکت ہوگی۔ اور جو شخص کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ہر زمانے کے ضروریات اور حالات کے لحاظ سے حذف و ترمیم اور اصلاح و اضافہ ہو سکتا ہے وہ دراصل اسلام سے دوام کا حق سلب کرتا ہے، کیوں کہ جو دین ناقص ہو اور حذف و اضافہ کا محتاج ہو، وہ اگر ہمیشہ کے لئے ذریعہ ہدایت ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا دعویٰ بھوٹا ہوگا۔ پھر جو شخص کہتا ہے کہ اسلام میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی انبیاء کے آنے کی گنجائش ہے۔ وہ درحقیقت اسلام کے استحکام پر ضرب لگاتا ہے۔ نبوت کا دروازہ کھلا رہنے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی جیت ہمیشہ پراگندگی اور تفریق کے خطرہ میں مبتلا رہے۔ ہر نئے نبی کے آنے پر کفر اور اسلام کی ایک نئی تفریق ہو۔ اور ہر ایسے موقع پر بہت سے وہ لوگ اسلام سے خارج ہوتے چلے جائیں جو خدا پر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ پس اسلام میں نبوت کا فتح باب درحقیقت فتنے کا فتح باب ہے۔ اسلام کی تاریخ کئی کے جتنے اسباب ممکن ہیں ان میں سے سب سے زیادہ مہلک اور خطرناک سبب یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام

میں نبوت کا دھوئے کرے۔ اُمتِ مسلمہ کا نظامِ جمیعت اسی بنیاد پر
تو قائم کیا گیا تھا کہ جو لوگ محمد رسول اللہ اور قرآن پر ایمان لائیں وہ
سب مسلم اور مومن ہیں، ایک ملت ہیں، ایک قوم ہیں، آپس میں
بھائی بھائی ہیں، رنج و راخت میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔
اب اگر کوئی شخص آئے اور کہے کہ محمد اور قرآن پر ایمان لانا کافی
نہیں ہے اس کے ساتھ مجھ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے اور جو مجھ پر ایمان
نہ لائے وہ کافر ہے اگرچہ وہ محمد اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو، پھر اسی
بنا پر وہ مسلمانوں میں کفر اور اسلام کی تفریق کرے اور قوم اس کے
ٹکڑے ٹکڑے کر دے جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قوم بنایا
تھا، اُن لوگوں کے درمیان برادری کے رشتے کو کاٹ دے جنہیں
قرآن نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ کہہ کر بھائی بھائی بنایا تھا، ان
کی نمازیں الگ کر دے، ان کے درمیان مناکحت کے تعلقات توڑ
دے، حتیٰ کہ ان میں عبادت اور تعزیت اور شرکتِ جنازات کا تعلق
بھی باقی نہ رکھے، تو اس سے بڑھ کر اسلام، اسلامی قومیت، اسلامی
تہذیب، اور اسلام کے نظامِ جماعت کا دشمن اور کون ہو سکتا ہے؟
اس بحث سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ رسالتِ محمدی کے ساتھ تکمیل
دین، نسخِ ادیانِ سابقہ اور ختمِ نبوت کا اعتقاد کس قدر اہمیت رکھتا
ہے، اور اسلام کے بقاء و استحکام اور اس کے شیوعِ عام کے لئے
اس کا داخلِ ایمان ہونا کیوں ضروری ہے۔

ایمان بالکتاب

اسلام کی اصطلاح میں ”کتاب“ سے مراد وہ کتاب ہے جو بندوں کی رہنمائی کے لئے اللہ کی طرف سے رسول پر نازل کی جاتی ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے کتاب گویا اسی پیغام کا سرکاری بیان یا اسلامی اصطلاح کے مطابق ”الہی کلام“ ہے جسے لوگوں تک پہنچانے اور جس کی توضیح و تشریح کرنے، اور جس کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے پیغمبر دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ ”کتاب“ کس معنی میں اللہ کا کلام ہے، اور اس کے کلام اللہ ہونے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ خالص الہیات کی بحث ہے جس کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم کو اس پر صرف اس پہلو سے نظر ڈالنی ہے کہ تہذیب اسلامی کی تاسیس میں ایمان بالکتاب کا کیا حصہ ہے؟ اور اس کے لئے صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ پیغمبرؐ کے ذریعہ سے جو تعلیم بندوں کو دینی مقصود ہے اس کے اصول اور احکام مسائل خدا کی طرف سے پیغمبر کے دل پر القا ہوتے ہیں، اس کے الفاظ اور معانی دونوں میں پیغمبر کی اپنی عقل و فکر، اس کے ارادے اور اس کی خواہش کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ لفظاً اور معنی خدا کا کلام ہوتا ہے نہ کہ پیغمبر کی تصنیف۔ پیغمبر اس کلام کو ایک امانتدار قاصد کی حیثیت سے خدا کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ پھر خدا کی عطا کی ہوئی بصیرت سے اس کے معانی اور مطالب کی تشریح کرتا ہے انہی الہی اصولوں پر اخلاق و معاشرت اور تہذیب و تمدن کا نظام قائم

کرتا ہے۔ اپنی تعلیم و تلقین اور اپنی پاکیزہ سیرت سے لوگوں کے خیالات و رجحانات اور افکار میں ایک انقلاب برپا کرتا ہے۔ تقویٰ و طہارت اور پاکیزگی نفس اور حسن عمل کی روح ان میں پھونکتا ہے۔ اپنی تربیت اور عملی رہنمائی سے ان کو اس طور پر منظم کرتا ہے کہ ان سے ایک نئی سوسائٹی، نئی ذہنیت، نئے افکار و خیالات، نئے آداب و اطوار، اور نئے آئین و قوانین کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے۔ پھر وہ ان میں اللہ کی کتاب اور اس کے ساتھ اپنی تعلیم اور اپنی پاکیزہ سیرت کے آثار چھوڑ جاتا ہے جو ہمیشہ اس جماعت اور اس کے بعد آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

رسالت اور کتاب کا تعلق

”رسالت“ اور ”کتاب“ دونوں اسی ایک خدا کی طرف سے ہیں۔ دونوں ایک امرِ ربانی کے اجزاء اور ایک ہی مقصد اور ایک ہی دعوت کی تکمیل کے ذریعے ہیں۔ وہی اللہ کا علم اور اس کی حکمت رسول کے سینے میں بھی ہے اور کتاب کے اوراق میں بھی۔ جس تعلیم کا لفظی بیان ”کتاب“ ہے اسی کا عملی نمونہ رسول کی زندگی ہے۔

انسان کی فطرت کچھ اس طور پر واقع ہوئی ہے کہ وہ مجرد کتابی تعلیم سے کوئی غیر معمولی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کو علم کے ساتھ ایک انسانی معلم اور رہنما کی بھی حاجت ہوتی ہے جو اپنی تعلیم سے اس علم کو دلوں میں بٹھا دے اور اس کا مجسمہ بن کر اپنے عمل سے لوگوں میں وہ روح پھونک دے جو اس تعلیم کا حقیقی منشاء ہے۔ آپ کو پوری انسانی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہ مل سکے گی کہ تنہا کسی کتاب نے انسانی معلم کی ہدایت اور تعلیم کے بغیر کسی قوم کی ذہنیت اور زندگی میں

انقلاب پیدا کیا ہو۔ جن رہنماؤں نے قوموں کے افکار و اعمال میں زبردست انقلابات پیدا کیے ہیں اگر وہ خود اپنی تعلیم کے مکمل عملی نمونے بن کر نہ پیدا ہوتے، اور صرف ان کی تعلیمات اور ان کے اصول کسی کتاب کی شکل میں شائع ہو جاتے تو انسانی فطرت کا کوئی راز داں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ محض اسے کتاب سے وہی انقلابات رونما ہوتے جو ان رہنماؤں کی عملی تعلیم سے ہوئے۔

دوسری طرف یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ وہ انسانی رہنما کے ساتھ اس کی تعلیم کا ایک مستند اور معتبر بیان بھی چاہتی ہے، خواہ وہ کاغذ پر لکھا ہوا ہو، یا سینوں میں محفوظ ہو۔ رہنما جن اصولوں پر جماعت کے افکار و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بناء رکھتا ہے وہ اگر اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ رہیں تو رفتہ رفتہ اس کی تعلیم کا نقش دھندلا ہوتا جاتا ہے اور اس نقش کے مٹنے کے ساتھ انفرادی سیرت اور اجتماعی نظم و آئین کی بنیادیں بھی کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ آخر میں اس جماعت کے پاس صرف افسانے ہی افسانے رہ جاتے ہیں جن میں ایک طاقتور نظام تمدن کو سنبھالنے کی قوت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن رہنماؤں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی ان کے متبعین گمراہی میں پڑ گئے، ان کی بنائی ہوئی امت ہر قسم کے اعتقادی، فکری، عملی، اخلاقی اور تمدنی مفاسد میں مبتلا ہو گئی، اور کوئی چیز ان کے پیچھے باقی نہیں رہی جس سے وہ صحیح اور اصلی اصول اخذ کیے جاسکیں جن پر ابتداء اس امت کی شیرازہ بندی کی گئی تھی۔

فاطر کائنات اپنی مخلوق کی اس فطرت سے واقف تھا، اس لیے اس نے جب نوع بشری کی ہدایت کا ذمہ لیا تو اس کے لیے رسالت اور تنزیل دونوں کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری کیا۔ ایک طرف بہترین سیرت

رکھنے والے انسانوں کو رہنمائی کے منصب پر مقرر کیا اور دوسری طرف اپنا کلام بھی نازل کیا تاکہ یہ دونوں چیزیں انسانی فطرت کے ان دونوں مطالبوں کو پورا کر دیں۔ اگر رہنما کتاب کے بغیر آتے، یا کتابیں رہنماؤں کے بغیر آتیں تو حکمت کا مقصود پورا نہ ہو سکتا۔

چراغ اور رہنمائی قرآنی مثال

رسالت اور کتاب کے اس تعلق کو قرآن مجید ایک تمثیلی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس نے جگہ جگہ رسول کو رہنما اور بدرقہ سے تشبیہ دی ہے جس کا کام گمراہوں کو سیدھا راستہ بتانا ہے، مثلاً وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا (الانبیاء-۵) وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد-۱) فَاتَّبِعْنِي أَهْدِيكَ صِرَاطًا سَوِيًّا (مریم-۳) وَأَهْدِيكَ إِلَى رَبِّكَ فَتَخْشَى (النازعات-۱)۔ دوسری طرف وہ کتاب کو ”نور“ اور ”ضیاء“ اور ”برہان“ اور ”فرقان“ اور ”منیر“ اور ”مبین“ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، مثلاً وَاتَّبِعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ (الاعراف-۱۹) وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى وَهَارُونَ الْفُرْقَانَ وَضِيَاءً (الانبیاء-۴) قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (المائدہ-۳) قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ (النساء-۲۴)۔ یہ تشبیہات محض شاعری نہیں ہیں بلکہ ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ معمولی انسان کو فطری عقل اور اکتسابی علم سے اتنی روشنی اور رہنمائی حاصل نہیں ہوتی جس سے وہ حق کی سیدھی راہ پر چل سکے۔ اس اجنبی اور اندھیری منزل میں اس کو ایک ایسے غیر معمولی رہنما کی ضرورت ہے جو اس منزل کی رسم و راہ سے واقف ہو، اور ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں ایک چراغ بھی ہو، تاکہ وہ اسے لے ہوئے قدم قدم پر بتاتا چلے کہ یہاں گڑھا ہے، یہاں قدم پھسلتا ہے، یہاں کانٹے

اور جھاڑیاں ہیں، یہاں سے دوسرے ٹیڑھے اور غلط راستے نکلتے ہیں اور اس کے پیچھے چلنے والا انسان خود بھی اس چراغ کی روشنی میں راہ کے نشانات کو دیکھ کر، سیدھی راہ کی علامات کو پہچان کر، ٹیڑھے راستوں کے موڑوں اور نکتوں سے واقف ہو کر، علی وجہ البصیرت اس کے اقتدا کرے۔ رات کے اندھیرے میں رہنا اور چراغ کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہی تعلق رسول اور کتاب میں بھی ہے۔ اگر ہم رہنا کے ہاتھ سے چراغ چھین لیں اور خود اس کو لے کر چلنے لگیں تو راستے میں ہم کو بہت سے ایسے تراپے چوراپے اور متشابہ راستے ملیں گے جہاں ہم کو یا تو حیران و پریشان ہو کر ٹھہر جانا ہوگا، یا ہم اسے چراغ کی روشنی میں کسی غلط راستے پر چلنے لگیں گے، کیونکہ محض چراغ کا وجود انسان کو رہنا سے بے نیاز نہیں کرتا۔ اسی طرح اگر رہنا کے ہاتھ میں چراغ نہ ہو تو ہم محض اندھے مقلد کی طرح اس کا دامن پکڑتے ہوئے چلیں گے اور روشنی کے بغیر ہم میں خود اتنی بصیرت پیدا نہ ہوگی کہ سیدھے راستے کو ٹیڑھے راستوں سے ممتاز کر کے دیکھ سکیں اور سیدھی راہ کے ان نازک مقامات کو بھی پہچان لیں جہاں انسان ٹھوکر کھاتا ہے یا اس کا قدم پھسل جاتا ہے۔ پس جس طرح ہم کو رات کی تاریکیوں میں اجنبی راہوں پر چلنے کے لئے ایک ایسے بدرقے کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اس منزل کی رسم و راہ سے خوب واقف ہو، اور ایک مشعل کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی روشنی میں ہم اس راستے کو خوب پہچان سکیں، اور ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی ہم بے نیاز نہیں ہو سکتے، اسی طرح حقیقت کی اجنبی منزل میں، جہاں ہماری عقل کی روشنی تنہا کام نہیں دیتی، ہم کو رسول اور کتاب دونوں کی یکساں ضرورت ہوتی ہے ان میں سے کسی کے اتباع کو چھوڑ

کر ہم سیدھی راہ نہیں پاسکتے۔

رُسول وہ ماہر بدرقہ ہے جو خدا کی دی ہوئی بصیرت سے ہدایت کی صراطِ مستقیم کو جانتا ہے اور اس منزل کی رسم و راہ سے ایسا واقف ہوتا ہے جیسا کسی راہ پر سینکڑوں مرتبہ چلا ہوا بدرقہ اس کے ہر قدم کی تفصیلی کیفیات سے واقف ہوا کرتا ہے۔ اس بصیرت کا نام ”حکم“ اور ”علم“ اور ”شرح صدر“ اور ”تعلیم الہی“ و ”ہدایت ربانی“ ہے جسے خصوصیت کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو عطا کیے جانے کا ذکر بار بار قرآن میں آیا ہے، مثلاً اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (نشرح) وَاَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمْنَاكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء۔ ۱۱) وَكُلًّا اَتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء۔ ۶) اَتَّبِعُوا مَنْ لَا یَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ۔ (یس۔ ۲) اور کتاب وہ روشن چراغ ہے جس کی مدد سے رُسول اپنے پیروؤں کو نہ صرف سیدھی راہ چلاتا ہے، بلکہ انہیں اسی نورِ علم اور روشنی فکر اور عرفانِ حق سے بہرہ مند کر دیتا ہے جو ایک بالاتر درجے میں اللہ کی طرف سے خود اس کو عطا ہوا ہے، اور اپنی تعلیم و تربیت سے انہیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ اگر وہ اس کے نقشِ قدم پر چلیں اور اس چراغ کو ہاتھ میں رکھیں تو نہ صرف خود ہدایت پائیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی رہنما اور امام بن جائیں۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّورِ۔ (ابراہیم۔ ۱)

”یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تیری طرف آمارا تاکہ تو

لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی میں نکالے لائے۔“

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ

إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔ (النحل - ۶)

”اور ہم نے تجھ پر ذکر (قرآن) اُتاتا کہ تو لوگوں کے لئے اس ہدایت کو واضح کر دے جو ان کی طرف اُتاری گئی ہے شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔“

پھر ایک مبلغ انداز میں قرآن نے یہ بھی بتا دیا کہ مادی جسمانی عالم میں چراغ اور رہنما کے درمیان جو مغائرت ہے وہ عالم حقیقت میں رسول اور کتاب کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک اتحادی رشتہ ہے۔ چنانچہ بعض جگہ جس چیز سے کتاب کو تشبیہ دی گئی ہے اسی چیز سے کسی دوسری جگہ رسول کو بھی تشبیہ دی گئی ہے، اور اسی طرح اس کے برعکس۔ آیہ یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَذَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِآذِينِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا (احزاب - ۶) میں رسول کو چراغ روشن کہا گیا ہے اور آیہ إِنَّ هَذِهِ الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلْبَاقِي هِيَ أَقْوَمُ (بنی اسرائیل - ۱) میں کتاب کو رہنما کہا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور رسول کا تعلق حقیقتاً ناقابل انقطاع ہے۔ انسان کو ہدایت کے لئے دونوں کی یکساں ضرورت ہے انسان جس فکری و عملی نظام اور جس تہذیب و تمدن کو قائم کرنا چاہتا ہے اُس کے قیام و استحکام، اور اس کے قائماً اپنی صحیح شکل میں رہنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہمیشہ رسالت اور کتاب دونوں کے ساتھ اس کا تعلق برقرار رہے۔ اسی شدید ضرورت کی بنا پر رسالت اور کتاب دونوں کو الگ الگ مستقل اجزائے ایمان قرار دیا گیا اور ہر ایک پر ایمان لانے کی بار بار تاکید کی گئی۔ اگر تاکید مقصود نہ ہوتی تو ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ رسول کی تصدیق اس کی لاف

ہوئی کتاب کی تصدیق کو متضمن ہے، اور کتاب کی تصدیق اس کے
لانے والے کی تصدیق کو۔

تمام کتب آسمانی پر ایمان

جہاں تک ایمان کا تعلق ہے، اسلام ان تمام کتابوں کو ماننے کا
حکم دیتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کے رسولوں پر نازل کی گئی ہیں۔
مسلمان ہونے کے لئے جس طرح تمام رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانا
ضروری ہے، اسی طرح تمام کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے چنانچہ
قرآن میں بار بار کہا گیا ہے:-

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ

مِنْ قَبْلِكَ - (البقرہ - ۱)

”اور پرہیزگار وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو
تیری طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے اُتاری
گئی تھیں۔“

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖا وَكُتُبِهٖا وَرُسُلِهٖا۔

(البقرہ - ۲۰)

”رسول اور سب مومن ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے

فرشتوں پر اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر۔“

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

يَدَيِّهِا۔ (آل عمران - ۱)

”اللہ نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری جو تصدیق کرتی ہے

ہے اُن تمام کتابوں کی جو اس سے پہلے آچکی ہیں۔“

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ

عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

وَالْأَسْبَاطِ وَمِمَّا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَالنَّبِيُّونَ
مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَدَا
مُسْلِمُونَ۔ (آل عمران - ۹)

”کہہ دے کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس کتاب پر جو
ہم پر اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور
اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد یعقوبؑ پر اتاری گئی تھیں۔ اور جو
موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف
سے دی گئی تھیں۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے
اور ہم اس کے تابع فرمان ہیں۔“

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَمِمَّا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا
فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذَا الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ
يُسْحَبُونَ فِي الْحَبِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ۔

(المومن - ۸)

”جن لوگوں نے اس کتاب اور ان کتابوں کو جھٹلایا جن کے
ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا تھا ان کو عنقریب اس کا انجام معلوم
ہو جائے گا۔ جب طوق و سلاسل ان کی گردنوں میں پڑے ہوں گے
اور وہ کھوتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے۔ پھر آگ میں
جھونک دیئے جائیں گے۔“

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ
الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

(الحديد - ۳)

”بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیوں کے ساتھ
بھیجا تھا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری تھی، اور ترازو تاکہ لوگ حق

پر قائم ہوں۔

اس اجمالی بیان کے ساتھ بعض کتابوں کے نام لے کر بھی ان پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے مثلاً تورات کو ہدایت، نور، فرقان، ضیاء، امام اور رحمت کہا گیا ہے (القصص (۵) المائدہ (۶) الانبیاء (۴) احقاف (۲)۔ اور انجیل کو بھی ہدایت، نور اور موعظت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے (المائدہ ۴۷)۔ پس یہ بات اسلام کے اصول میں سے ہے کہ جن کتابوں کا ذکر تصریح کے ساتھ قرآن میں کیا گیا ہے ان پر صراحتہً، اور جن کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ان پر اجمالاً ایمان لایا جائے۔ اسلامی اعتقاد کے مطابق دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں اللہ کے رسول اس کی طرف سے کتابیں لے کر نہ آئے ہوں، اور جتنی کتابیں دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف قوموں میں آئیں وہ سب ایک ہی سرچشمے کی نہریں، ایک ہی آفتاب کی شعاعیں تھیں۔ سب اُسی حق اور صداقت اور ہدایت اور نور کے ساتھ آئی تھیں جس کا نام ”اسلام“ ہے۔ اس لئے جو ”مسلم“ ہے وہ ان سب پر ایمان لاتا ہے، اور جو ان میں سے کسی کی تکذیب کرتا ہے وہ سب کی تکذیب اور فساد حقیقت اصل سرچشمے کی تکذیب کا مجرم ہے۔

صرف قرآن کا اتباع

لیکن ایمان کے بعد جہاں سے بالفعل اتباع کی سرحد شروع ہوتی ہے وہاں دوسری کتابوں سے تعلق منقطع کر کے صرف قرآن کیساتھ تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس کے متعدد وجوہ ہیں:-
اولاً کتب آسمانی میں بہت سی کتابیں تو اب معدوم ہیں، اور جو پائی جاتی ہیں ان میں قرآن کے سوا کوئی کتاب اپنے اصل الفاظ

اور معانی میں محفوظ نہیں ہے۔ کلام الہی کے ساتھ کلام انسانی لفظاً اور معنیً دونوں طرح شریک ہو گیا ہے۔ ہدایت کے ساتھ گمراہی، جو خواہشات نفسانی کے اتباع کا لازمی نتیجہ ہے، ان کتابوں میں مل جُل گئی ہے۔ اب یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ ان میں حق کس قدر ہے اور باطل کس قدر۔ یہی حال ان کتابوں کا بھی ہے جن پر مختلف ملیں اپنے دین کا مدار رکھتی ہیں، اور جن کے آسمانی ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جن میں مُنزل من اللہ ہونے کا تخیل ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔ بعض کے متعلق یہ تک پتہ نہیں چلتا کہ اگر وہ خدا کی طرف سے آئی تھیں تو کن نبیوں کے پاس آئیں اور کس زمانے میں آئیں۔ بعض کی زبانیں ایسی مُردہ ہو چکی ہیں کہ آج ان کے صحیح معانی متعین کرنا مشکل ہے۔ بعض میں انسانی خواہشات اور غلط تخیلات و اوہام کی صریح آمیزش معلوم ہوتی ہے۔ بعض میں شرک، غیر اللہ کی پرستش اور ایسے ہی دوسرے غلط عقائد اور اعمال کی صریح تعلیم موجود ہے جو کسی طرح حق نہیں ہو سکتی۔ ایسی کتابیں جن کا یہ حال ہو، انسان کو صحیح علم اور صحیح روشنی نہیں دے سکتیں انسان اُن کا اتباع کر کے گمراہی سے محفوظ نہیں ہو سکتا۔

ثانیاً، قرآن کے سوا جتنی کتابیں اس وقت موجود ہیں، عام اس سے کہ آسمانی ہوں یا ان کے متعلق آسمانی ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہو، ان کی تعلیمات اور ان کے احکام میں یا تو محدود نسلی قومیت کا اثر نمایاں ہے، یا مخصوص زمانی حالات کا اقتضاء غالب۔ وہ ہر زمانے میں تمام نوع بشری کے لئے ہدایت و رہنمائی کا نہ کبھی ذریعہ بنی ہیں اور نہ بن سکتی ہیں۔

ثالثاً، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کتابوں میں سے ہر ایک میں

ایسی تعلیمات موجود ہیں جو حق اور صدق ہیں، اور ان میں انسان کے اخلاق اور معاملات کی اصلاح کے لئے بعض اچھے اصول اور قوانین بھی موجود ہیں۔ لیکن ان میں کوئی ایک کتاب ایسی نہیں ہے جو تمام خیرات کی جامع ہو، جس میں پورا حق ظاہر کر دیا گیا ہو، جو تنہا انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی صحیح رہنمائی کر سکتی ہو۔

قرآن مجید ان تینوں خامیوں سے پاک ہے۔

۱۔ وہ انہی الفاظ میں محفوظ ہے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پیش کیا تھا۔ اول روز سے سینکڑوں، ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے ہر زمانے میں اس کو لفظ بلفظ یاد کیا ہے، لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے روزانہ اس کی تلاوت کی ہے، ہمیشہ اس کے نسخے ضبط کتابت میں لائے جاتے رہے ہیں، اور کبھی اس کی عبارت میں ذرہ برابر اختلاف نہیں پایا گیا ہے۔ لہذا اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو قرآن نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا گیا تھا وہی آج دنیا میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس میں کبھی ایک لفظ کا تغیر و تبدل نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ وہ عربی زبان میں اُترا ہے جو ایک زندہ زبان ہے۔ اس کے بولنے والے اور سمجھنے والے آج کروڑوں انسان موجود ہیں، اور آج تک اس زبان کا فصیح اور معیاری لٹریچر وہی ہے جو نزول قرآن کے وقت تھا۔ اس کے معانی اور مطالب معلوم کرنے میں انسان کے لئے وہ دقتیں نہیں ہیں جو مُردہ زبانوں کی کتابوں کے سمجھنے میں پیش آتی ہیں۔

۳۔ وہ سراسر حق، اور از اول تا آخر الہی تعلیمات سے لبریز ہے۔

اس میں کہیں انسانی جذبات، نفسانی خواہشات، قومی یا طائفی خود غرضیوں اور جاہلانہ گمراہیوں کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس کے اندر کلام الہی کے ساتھ انسانی کلام کی ذرہ برابر آمیزش نہیں ہو سکی ہے۔

۴۔ اس میں تمام نوع بشری کو خطاب کیا گیا ہے اور ایسے عقائد، اصول اخلاق اور قوانین عمل پیش کیے گئے ہیں جو کسی ملک و قوم اور کسی خاص زمانے کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ اس کی ہر تعلیم عالمگیر بھی ہے اور جاودانی بھی۔

۵۔ اس کے اندر ان تمام حقائق و معارف اور خیرات و صالحات کو جمع کر دیا گیا ہے جو اس سے پہلے آسمانی کتابوں میں بیان کیے گئے تھے۔ کسی مذہب کی کتاب سے ایسی کوئی بات نکال کر نہیں بتائی جا سکتی جو حق اور نیکی ہو اور قرآن اس کے ذکر سے خالی ہو۔ ایسی جامع کتاب کی موجودگی میں انسان آپ سے آپ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

۶۔ وہ آسمانی ہدایات اور الہی تعلیمات کا جدید ترین مجموعہ (Latest Edition) ہے۔ بعض ہدایات، جو پچھلی کتابوں میں مخصوص حالات کے تحت دی گئی تھیں، وہ اس میں سے نکال دی گئیں اور بہت سی نئی تعلیمات جو پچھلی کتابوں میں نہ تھیں، اس میں اضافہ کر دی گئیں۔ لہذا جو شخص آباؤ اجداد کا نہیں بلکہ فی الواقع خدائی ہدایت کا پیرو ہے ہے اس کیلئے لازم ہے کہ اسی آخری اور جدید ایڈیشن کا اتباع کرے نہ کہ پرانے ایڈیشنوں کا۔

یہی وجہ ہیں جن کی بناء پر اسلام نے تمام کتابوں سے اتباع کا تعلق منقطع کر کے صرف قرآن پاک کو متبوع قرار دیا ہے اور تمام دنیا کو دعوت دی ہے کہ وہ اسی ایک کتاب کو اپنا دستور العمل

بنائے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ

النَّاسِ بِمَا أَسَاءَ اللَّهُ۔ (النساء - ۱۴)

”ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تو

لوگوں کے درمیان اُس علم حق کے ساتھ فیصلہ کرے جو خدا نے

تجھے دیا ہے۔“

فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَ

اتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ

الْمُفْلِحُونَ۔ (اعراف - ۱۹)

”پس جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی

مدد اور حمایت کی اور اُس نور کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ اُترا

ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

اور یہی وجہ ہے کہ اُن قوموں کو بھی قرآن پاک پر ایمان لانے

اور اس کا اتباع کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن کے پاس پہلے

سے کوئی آسمانی کتاب موجود ہے۔ چنانچہ بار بار قرآن میں حکم دیا جاتا

ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا الْكِتَابَ آمَنُوا بِمَا نَزَّلْنَا

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ (النساء - ۷)

”اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ہے، ایمان لاؤ اس کتاب

(قرآن) پر جسے ہم نے اُتارا ہے اور جو ان کتابوں کی تصدیق

کرتی ہے جو تمہارے پاس ہیں۔“

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ

كَثِيرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو

عَنْ كَثِيرٍ، قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ
مُبِينٌ يَهْدِي بِإِذْنِ اللَّهِ مَنِ اتَّبَعَ بِرِضْوَانِنَا
سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ
بِإِذْنِنَا وَيَهْدِي إِلَيْهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔

(المائدہ-۳)

”اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو
تمہارے لیے اُن بہت سی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے جن کو تم کتاب
میں سے چُھپاتے تھے، اور بہت سی چیزوں سے معاف بھی کر
دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور کھول کر بیان
کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ اُن لوگوں
کو سلامتی کی راہوں کی طرف ہدایت بخشتا ہے جو اسکی خوشنودی
کا اتباع کرتے ہیں، اور وہ اپنے اذن سے ان کو تارکیوں سے
روشنی کی طرف نکال لاتا ہے اور سیدھے راستے کی طرف ان کھے
رہنمائی کرتا ہے۔“

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ مَّبَيِّنَاتٍ وَمَا يَكْفُرُ
بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ۔ (البقرہ-۱۲)

”اور ہم نے تیری طرف واضح اور کھلی ہوئی آیتیں اتار دی

ہیں، اور ان کا انکار صرف وہی کرتے ہیں جو فاسق ہیں۔“

قرآن کے متعلق تفصیلی عقیدہ

جو کتاب انسان کے لیے فکر و اعتقاد کی صحیح رہنما قرار دی گئی ہو،
اور جس کو عملی زندگی کے لیے واجب الاتباع قانون مقرر کیا گیا ہو،
اس کی پیروی اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ انسان
اس کے صحیح اور برحق ہونے اور غلطیوں سے محفوظ ہونے کا پورا

پورا یقین نہ رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر اُس کی صحت کے متعلق کسی قسم کے شک نے راہ پالی تو اُس پر سے اطمینان اُٹھ جائے گا اور پھر جمعیتِ خاطر کے ساتھ اُس کی پیروی نہ کی جاسکے گی۔ اس ضرورت کی بنا پر ایمان بالقرآن کے لازمی اجزاء حسبِ ذیل ہیں جن کو قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔

۱۔ قرآن جس زبان میں اُترا تھا اُسی عبارت میں محفوظ ہے کسی قسم کی کمی بیشی اُس میں نہیں ہوئی۔ اس پر حسبِ ذیل آیات دلالت کرتی ہیں :-

إِنَّا عَلَيْنَا جَمْعُهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قُرِئَهُ
فَاتَّبَعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّا عَلَيْنَا بَيَانَهُ۔ (البقرہ - ۱)

”اس کو جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھیں، تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔ پھر اس کے معانی کو سمجھا دینا بھی ہمارا کام ہے۔“

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ۔ (الاعلیٰ)
”ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے کہ تم بھولنے نہ پاؤ گے، بجز اس کے جسے خدا بھلانا چاہے۔“

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔
(الحجر - ۱)

”اس ذکر (قرآن) کو ہم ہی نے اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

وَآتِلْ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا
مُبْدِلَ لِكَلِمَاتِهَا۔ (الکہف - ۲)

”تیری طرف تیرے رب کی کتاب سے جو کچھ وحی کیا گیا ہے

اس کی تلاوت کر، اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔“
۲۔ قرآن کی تمزید میں کسی شیطانی قوت کا ذرہ برابر دخل نہیں

ہے۔

وَمَا تَنْزَلَتْ بِهِ الشَّيْطَانُ وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ
وَمَا يَسْتَطِيعُونَ، إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ۔

(الشعراء۔ ۱۱)

”اس کوئی کہ شیطان نہیں اُترے میں، نہ یہ کام ان کے
کرنے کا ہے، نہ وہ اس کو کر سکتے ہیں، بلکہ وہ تو وحی کے سننے
سے بھی دور رکھے گئے ہیں۔“

۳۔ قرآن میں خود نبی کی خواہش کا بھی کوئی دخل نہیں۔
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۚ
(النجم۔ ۱)

”وہ اپنے دل کی خواہش سے نہیں بول رہا ہے، بلکہ یہ جو
کچھ ہے وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔“

۴۔ قرآن میں باطل کو ہرگز کوئی راہ نہیں ملی۔
وَلَا تَأْتِيهِ الْغَيْبُ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ
بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ
حَمِيدٍ۔ (حم السجده۔ ۵)

”یقیناً یہ ایک محفوظ و مضبوط کتاب ہے۔ باطل نہ اس کے
آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ ایک حکیم اور سزاوار حمد ہستی
کی اتاری ہوئی ہے۔“

۵۔ قرآن سراسر حق ہے، گمان اور اندازہ کی بنا پر نہیں بلکہ علم
کی بنا پر اتارا گیا ہے، اس میں کمی اور ٹیڑھ نہیں ہے، ٹھیک ٹھیک

سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

وَيَزِيّ الدِّينِ أَوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقُّ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطِ
الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ۔ (سبار۔ ۱)

”اور جو لوگ علم رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو جو تیری طرف
تیرے رب کے پاس سے اُتاری گئی ہے سمجھتے ہیں کہ یہی
حق ہے اور خدائے عزیز و حمید کی طرف ہدایت کرتی ہے۔“

وَإِنَّا لَحَقُّ الْيَقِينِ۔ (الحاقہ۔ ۲)

”اور بلاشبہ وہ یقینی حق ہے۔“

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَى عِلْمٍ
هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (اعراف۔ ۴)

”اور ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس
کو ہم نے علم کی بنا پر مومنوں کے لئے مفصل ہدایت اور رحمت
بنایا ہے۔“

قُلْ أَنْزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ۔ (الفرقان۔ ۱)

”اے محمد! کہہ دو کہ یہ کتاب اُس نے اُتاری ہے جو آسمانوں
اور زمین کے سب راز جانتا ہے۔“

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ (البقرہ۔ ۱)

”یہی ایک کتاب ہے جس میں کوئی بات شک کی بنا پر نہیں
کہی گئی ہے۔“

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهُ عِوَجًا قِطْمًا۔ (الکہف۔ ۱)

”اور خدائے اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ وہ بالکل سیدھا ہے۔“

إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ۔

(بنی اسرائیل - ۱)

”اور بے شک یہ قرآن وہی راستہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھا

ہے۔“

۴۔ قرآن کے احکام اور اس کی تعلیمات میں رد و بدل کا حق کسی کو، حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی نہیں ہے۔

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبْدِلَ مَا مِنْ تِلْقَائِي
نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ
إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابٌ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔

(یونس - ۲)

”اے محمد! کہہ دو کہ میں اس کتاب کو اپنی طرف سے بدلنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں تو صرف اسی وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف اُتاری جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔“

۵۔ جو چیز قرآن کے خلاف ہے وہ ہرگز قابل اتباع نہیں

ہے۔

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا
تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهَا أَوْلِيَاءَ۔ (اعراف - ۱)

”جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اُتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کارسازوں کی پیروی نہ کرو۔“

یہ قرآن مجید کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ ہے اور اس کے ہر جُز پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ جس کے عقیدہ میں کسی جزو کی بھی کمی

ہوگی وہ قرآن کا صحیح اور کامل اتباع نہ کر سکے گا اور اُس راہِ راست سے ہٹ جائے گا جس کا نام ”اسلام“ ہے۔

جامعۃ اسلامی کا سنگِ بنیاد

ایک کتاب اور ایک رسول پر ایمان، اُسی کا اتباع، اُسی کے بنائے ہوئے سانچے میں ذہنیاتوں کا ڈھل جانا، اسی ایک منبع سے تمام اعتقادات و عبادات اور اخلاق و معاملات اور جملہ مدنی قوانین کا ماخوذ ہونا، اور اسی ایمان و اطاعت اور اتباع کے رشتے میں تمام پیروانِ اسلام کا منسلک ہونا، اسلام کو ایک مستقل تہذیب اور مسلمانوں کو ہر قسم کے نسلی و لسانی اور لونی و جغرافیائی اختلاف کے باوجود ایک قوم بناتا ہے۔ علم و عقل، تحقیق و اجتہاد، نقطہ نظر اور رجحانِ طبع کے فطری اختلاف سے یہ ممکن ہے کہ آیاتِ قرآنی اور سنتِ نبوی سے مسائل کے استنباط میں، اور ان کے مفہوم اور مقصود کے سمجھنے میں اختلاف واقع ہو جائے۔ لیکن ایسا اختلاف محض جزئی اور فروعی اختلاف ہے، اور یہ ان مختلف فقہی اور کلامی مذاہب کو الگ الگ دین، اور ان کے ماننے والوں کو جدا جدا قومیں نہیں بناتا۔ اصل چیز جس پر ملتِ اسلام کی بناء قائم ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیتِ رسولِ خدا ہونے کے واحد مقتدا، اور قرآن کو بحیثیتِ کتابِ الہی ہونے کے واحد کتابِ آئین تسلیم کرنا اور اسی سرچشمے کو جملہ عقائد اور قوانین کا ماخذ قرار دینا ہے۔ اس اصل میں جو لوگ متفق ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ ان کے درمیان فرعی امور میں کتنا ہی اختلاف ہو۔ اور اس اصل سے جو لوگ اختلاف رکھتے ہیں وہ سب اسلام کی نظر میں ایک دوسری قوم ہیں، خواہ وہ خود آپس میں کتنی ہی مختلف قومیتوں میں بٹے

ہوئے ہوں۔

قرآن دراصل اُن تمام اُمور کا جامع ہے جن پر اسلام کی بنا قائم ہے جو قرآن پر ایمان لایا، وہ گویا خدا اور اس کے ملائکہ اور اس کی کت ابولہ اسکے رسولوں اور یوم آخر پر بھی ایمان لے آیا۔ کیونکہ یہ تمام ایمان اپنی تفصیلات کے ساتھ قرآن میں موجود ہیں اور ایمان بالقرآن کے راست اور درست ہو جانے کا یقینی ثمرہ یہی ہے کہ انسان کو پورا ایمان حاصل ہو جائے۔ اسی طرح قرآن میں شریعت اسلام کے تمام اصول اور اساسی قوانین بھی مندرج ہیں جن کو صاحب شریعت علیہ السلام نے اپنے قول اور اپنے عمل سے واضح اور مشرح کر دیا ہے۔ لہذا جو شخص صحیح ایمان کے ساتھ قرآن اور سنت رسول کو اپنی زندگی کے تمام معاملات میں واجب الاتباع قانون قرار دیتا ہے، وہ یقیناً اعتقاد اور عمل کے لحاظ سے مسلمان ہے۔ اسی ایمان اور اتباع کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔ جہاں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں گی۔ وہاں اسلام بھی ہوگا اور جہاں یہ نہ ہوں گی وہاں اسلام بھی نہ ہوگا۔

ایمان بالیوم الآخر

یوم آخر سے مراد موت کے بعد کی زندگی ہے۔ اسی لئے اس کو حیاتِ آخرت اور دارِ آخرت بھی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس دوسری زندگی کے ذکر سے خالی ہو۔ طرح طرح سے اس کو ذہن نشین کیا گیا ہے۔ اس کی صداقت پر دلائل قائم کیے گئے ہیں۔ اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو شخص اُخروی زندگی پر ایمان نہیں لاتا اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔ وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (الاعراف۔ ۱۷) اور قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ۔ (الانعام۔ ۲۷)

حیاتِ اُخروی کا اعتقاد، جس کو اس شد و مد کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، بعض ایسے سوالات کا جواب ہے جو فطری طور پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔

چند فطری سوالات

انسان خوشی سے زیادہ غم، اور راحت سے زیادہ تکلیف و مصیبت کو محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حسیات کو جتنی زیادہ ٹھیس لگاتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوتِ فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ

کہاں سے آئی؟ کیونکر آئی اور کب تک رہے گی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھوئی جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے تو سن فکر کو ایک تازیانہ لگا دیتا ہے اور ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھوئی گئی؟ کہاں گئی؟ اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہ ہمیں کبھی پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لئے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشا گاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ کیسا ہنگامہ ہے؟ کیسے شروع ہو گیا؟ کس نے برپا کر دیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم اُجھتے ہیں۔ بخلاف اس کے موت اور اس کی تلخیوں سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے، ہر شخص کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے بے کس اور کمزور بھی مرتے ہیں۔ طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں۔ حسرت ناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں۔ عبرت ناک موتیں بھی پیش آتی ہیں۔ اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر اپنے گزرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گزرے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک اُلجھن نہ پیدا کی ہو، اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ یہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گزر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں؟

یہ تو ایک عام سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لیکر ایک بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں اُلجھے ہیں۔ لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں، اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے، ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی، اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے۔ جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھروسے ایک حرکت ہے۔ جس کو ہم بیکاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے ان میں سے ہر فعل کا رد فعل، ہر حرکت کی بازگشت، ہر کوشش کا ثمرہ، اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہیئے۔ نیکی کا پھل نیک اور بدی کا پھل بُرا ملنا لازم ہے۔ اچھی کوشش کا اچھا نتیجہ اور بُری کوشش کا بُرا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام مساعی کے ثمرات، تمام افعال کے جواب، ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گزاری۔ بعض شرارتوں کا پھل بلاشبہ اس کو دنیا میں مل گیا۔ کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا۔ کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں اور مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پورا پورا بدلہ اس کو دنیا میں نہ ملا۔ بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی۔ اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اُس کے نقصان کی کون سی تلافی ہوئی؟ پھر کیا اس شریک کے یہ ظلم، اور مظلوموں کے صبر،

سب کے سب بے نتیجہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے۔ بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے، اور ان کا پورا پورا ثمرہ انہیں دُنیا میں نہ ملا۔ بعض نیکیوں پر اُن کی اُلٹی بدنامی اور رُسوائی ہوئی۔ بعض نیکیوں پر وہ ستائے گئے۔ بعض نیکیوں پر انہیں سزائیں ملیں۔ بعض نیکیوں کا حال کبھی دُنیا پر کھلا ہی نہیں۔ پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اے اکارت گئیں؟ کیا اتنی سخت محنتوں اور کوششوں کا صرف اتنا ہی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص اور افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اسکے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پھیل ہو جاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہوتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور وجود میں آ جاتے ہیں۔ مگر کیا مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا؟ کیا یہ کہیں پہنچ کر ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ پانی، یہ زمین، یہ روشنی، یہ حرارت، اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے ساتھ یہ کارخانہ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے، کیا یہ سب لازوال ہیں؟ کیا ان کے لئے کوئی عمر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے، اور حیاتِ اخروی کا اعتقاد دراصل انہی سوالات کا جواب ہے۔ لیکن اس حل اور اس کی صداقت اور اس کے اخلاقی و تمدنی نتائج پر بحث کرنے سے پہلے دیکھنا چاہیے کہ خود انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی جو کوششیں

کی ہیں وہ کس حد تک کامیاب ہیں۔
حیاتِ اخروی کا انکار

ایک جماعت کہتی ہے کہ زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں جس کے بعد حیات، شعور، بھل، احساس اور نتائج کچھ بھی نہیں۔ اِنْ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُولٰی وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِّينَ (الدخان-۲) وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (الباقہ-۳) بخلاف اس کے یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے یونہی چلتا رہے گا اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے۔

جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ اس بناء پر نہیں کہتے کہ ان کو کسی ذریعہ علم سے تحقیق ایسا معلوم ہو گیا ہے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے، اور فی الواقع یہ کارخانہ عالم لازوال ہے، بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی، اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے۔ مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کیلئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیاء کا وجود اور ہمارا عدم احساس ہی اشیاء کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے

دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے اسے بہتے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت چونکہ ہمارے مشاہدے اور تجربے میں نہیں آئی اس لیے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر مبروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں اگر کارخانہ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست ہے کہ ہم نے اس کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی، کیونکہ میں نے نہ اس کو گرتے دیکھا ہے اور نہ اسے میں کوئی بوسیدگی مجھے نظر آتی ہے جو اس کے کبھی آئندہ گرنے کے پیش گوئی کرتی ہو۔ کیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

اخلاق پر انکارِ آخرت کا اثر

فلاسفہ اور علماء اب قریب قریب اس خیال پر متفق ہو چکے ہیں کہ ایک نہ ایک دن نظام عالم ضرور درہم برہم ہوگا۔ عالم کی ازلیت اور ابدیت کے قدیم فلسفیانہ نظریہ کو دہرانے والا شاید اہل علم کے جماعت میں کوئی بھی نہیں ہے۔ تاہم ابھی تک موت کو فنا کے محض کہنے والے بہت سے باقی ہیں اور ان کے اس قول کی بنا وہی غیر معقول بات ہے جو ابھی اوپر بیان ہوئی۔ لیکن اس کی غیر معقولیت

سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ اس قول سے انسان کو کبھی تسلی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور بہت سے وہ سوالات جو زندگی کے معاملات کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتے ہیں اس قول میں تشنہ جواب ہی رہ جاتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر انسان کے اخلاق اور اس کی سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قائم ہو تو یقیناً وہ دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ حالات ناموافق ہوں تو اس عقیدے سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوگی کیونکہ جب وہ اپنی نکوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائے گی۔ جب وہ اپنی مظلومی کی داد رسی کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ اور جب وہ شریروں، بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھوٹتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف نیچا ہی دیکھنے کے لئے ہے۔ بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ جو دن عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں بس وہی غنیمت ہیں۔ اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اس کی کسر پوری ہو وہ ظلم و ستم کرے گا لوگوں کے حقوق غصب کرے گا۔ اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آ سکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت، یا اور کسی قسم کے دنیوی فائدے حاصل ہو سکیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے ہی جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا۔ جن کا

نتیجہ کسی دُنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دُنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوں گی اور وہ بُرائیاں جن کا کوئی نقصان اس دُنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو، وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پوری سوسائٹی کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ^{حیثیت} پر قائم ہو تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے۔ اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسانیت کی بنیاد پر تعمیر ہو گا۔ نیکی محض دُنیوی فائدہ کی ہم معنی ہوگی اور بدی محض دُنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائے گی۔ جھوٹ اگر دُنیا میں نقصان کا موجب ہو تو گناہ ہوگا، اور فائدہ کا ذریعہ ہو تو عین صواب بن جائیگا۔ صداقت اگر دُنیا میں جلب منفعت کا ذریعہ ہو تو نیکی ہوگی، ورنہ بصورت نقصان اس سے بڑھ کر کوئی بدی نہ ہوگی۔ زنا لذت اور عیش کیلئے مستحسن ہوگی، اور اس میں بُرائی کا پہلو اگر کبھی پیدا ہوگا بھی تو صرف اس وقت جب کہ وہ صحت کے لئے موجب نقصان ہو۔ غرض جہاں اس دُنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا بُرے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا اُمید نہ ہو، وہاں انسان افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دُنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائے گا جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایسے اخلاقی معیاروں کے ساتھ کوئی انسانی گروہ جانوروں سے بھی زیادہ بدتر درجے تک گرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ سزا اور جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام ضمیر ہے۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزا ہیں۔ اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں، اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنی پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں انہی کی تائید ان کا ضمیر کرنے لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایک ہندو کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے، ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا، پس اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھر جائے گا۔ وہ نہ ان افعال پر سرزنش کرے گا جن کو اب اس سوسائٹی نے گناہ سمجھنا چھوڑ دیا ہے، اور نہ ان افعال میں اطمینان محسوس کرے گا جن کو اب یہ سوسائٹی نیکی ہی نہیں سمجھتی۔

نظریہ تنازع

دوسری جماعت وہ ہے جس نے تنازع کا نظریہ پیش کیا ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ موت کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے

کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کر لیتی ہے اور وہ دوسرا جسم، یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال بُرے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بُری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ تو اس کی رُوح ادنیٰ درجہ کی حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی، اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں اس نے بہم پہنچائی ہیں تو رُوح اعلیٰ طبقتوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رُوسے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دُنیا اور انہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اسی دُنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں۔ تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔

یہ نظریہ ایک زمانہ میں بہت مقبول رہا ہے۔ یونان میں مسیح سے کئی صدی قبل فیثاغورث اور اَپْذَقْلَس وغیرہ اس کے قائل تھے روم میں بھی مسیحیت سے پہلے اس کا چرچا تھا۔ مصر کی قدیم تاریخ میں بھی اس کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ یہودیوں میں بھی بیرونی اثرات سے تنازع کا عقیدہ داخل ہو گیا تھا۔ لیکن اب یہ اعتقاد یا تو توہندی الاصل مذاہب (برہمنیت، بودھ مت، جین مت وغیرہ) میں پایا جاتا ہے، یا پھر مغربی افریقہ، جنوبی افریقہ، مدغاسکر، وسطی اسٹریلیا، انڈونیشیا، اوشیانیا، شمالی و جنوبی امریکہ وغیرہ کی وحشی یا نیم وحشی قوموں میں۔ باقی تمام مہذب قومیں اس کو رد کر چکی ہیں، کیونکہ انسان نے اب تک علم و عقل کی ترقی سے دُنیا اور اس کی زندگی کے متعلق جس قدر واقفیت بہم پہنچائی ہے وہ ان تمام نظریات کی تردید کرتی ہے جن پر نظریہ تنازع کی بنا قائم ہے۔ خود

ہندی الاصل مذاہب میں بھی جب ہم اس نظریہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدک ہندوستان میں یہ تخیل سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ اُس زمانہ کے آریوں کا عقیدہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد انسان کو ایک دوسری زندگی ملتی ہے جو نیکو کاروں کے لیے سراسر راحت اور بدکاروں کے لیے سراسر مصیبت ہے اس کے بعد دفعۃً اس نظریہ میں تغیر واقع ہوتا ہے، اور دوسرے دور کے ہندوستانی لٹریچر میں ہم کو وہ کتابیں ملتی ہیں جن میں تناسخ کا نظریہ ایک فلسفیانہ اعتقاد کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اس تغیر کا سبب ابھی تک مستحق نہیں ہو سکا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ تخیل آریوں میں دراوڑ قوموں سے آیا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ خود آریوں کے ادنیٰ طبقوں میں موجود تھا، اور انہی سے بعد کے برہمن فلسفیوں نے اس کو لے کر تخیلات اور قیاسات کی ایک پوری عمارت اس پر قائم کر دی۔ اسی طرح بودھ مذہب بھی ابتدائاً تناسخ کی اس مفصل اسکیم سے خالی تھا جو بعد کے بودھی لٹریچر میں پائی جاتی ہے۔ جہاں تک قدیم لٹریچر سے پتہ چلتا ہے، ابتدائین بودھ دھرم کا نظریہ یہ تھا کہ وجود ایک دریا ہے جو مسلسل تغیر اور انقلاب کی شان سے بہتا چلا جا رہا ہے۔ اسی تخیل نے آگے چل کر یہ صورت اختیار کی کہ تمام عالم کی ایک ہی روح اور تمام عالم میں ایک ہی وجود ہے جو صورتوں پر صورتیں اور قالب پر قالب بدلتا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتداء میں وحی و الہام کے سرچشمے سے ہندی قوموں کو جو علم حاصل ہوا تھا اُس کو انہوں نے بدل کر ایک ایسا فلسفیانہ مذہب ایجاد کر لیا جو محض ان کی اپنی اتباع کا نتیجہ تھا۔

عقلی تنقید

یہاں تنازع کے مسئلہ پر کسی مفصل بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے اتنا اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عقیدہ تنازع کی بنیاد ایسے نظریات پر ہے جو صریح عقل کے خلاف ہیں۔ اور ان تمام علوم کے منافی ہیں جو اُس تک انسان کو دُنیا اور اس کی زندگی پر غور و خوض کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ اہل تنازع کا خیال ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا نتیجہ اسی دُنیا میں اس طرح ملتا ہے کہ وہ اپنے اچھے اعمال کی بدولت زندگی کے اعلیٰ طبقات کی طرف صعود کرتا ہے اور بُرے اعمال کی بدولت ادنیٰ طبقات کی طرف اتر جاتا ہے۔ مثلاً اگر انسان نے اس زندگی میں بُرے عمل کیے۔ تو وہ حیوانی اور نباتی طبقات کی طرف نزول کرے گا۔ اور اگر حیوان نے اپنی زندگی میں اچھے عمل کیے تو وہ انسانی طبقات کی طرف صعود کرے گا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حیوانی اور نباتی زندگی سے نتیجہ ہے انسانی زندگی کے بُرے اعمال کا، اور انسانی زندگی سے نتیجہ ہے نباتی اور حیوانی زندگی کے اچھے اعمال کا۔ بالفاظِ دیگر اس وقت جو انسان ہیں وہ اس لئے انسان ہیں کہ پہلے انہوں نے نباتی اور حیوانی زندگی میں اچھے اعمال کیے تھے۔ اور اس وقت جو نباتات اور حیوانات ہیں وہ اس لئے ایسے ہیں کہ انہوں نے انسانی زندگی میں بُرے اعمال کیے تھے۔ اس نظریہ کو ماننے کے لئے چند اور باتوں کا ماننا ضروری ہے اور وہ سب علم و عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً

۱۔ تنازع کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان

ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لئے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ یہ کھلا ہوا دور ہے جس کو عقل محال قرار دیتی ہے۔

۲۔ اگر تنازع کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح جو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے بھی جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں، ازلی اور ابدی ہوں، اور یہ زمین اور یہ نظام شمسی اور یہ قوتیں جو اس نظام میں کام کر رہی ہیں، یہ سب بھی ازلی اور ابدی ہوں۔ لیکن عقل کا دعویٰ ہے اور علمی تحقیقات اس پر شہادت دیتی ہیں کہ ہمارا نظام شمسی نہ ازلی ہے اور نہ ابدی۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات اور حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے کہ جو نفس انسان کے قالب میں عقل و فکر کی قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں پہنچ کر لایعقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں پہنچ کر اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق دراصل ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالا ارادہ کیے جائیں۔ اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں اور ان پر جزا و سزا مترتب ہو سکتی ہے۔ لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیک اور بدی کا اطلاق جائز ہے اور نہ ان پر جزا و سزا مترتب ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے ایسا حکم لگانے کے لئے یہ ماننا ضروری ہوگا کہ نباتات اور حیوانات میں بھی سوچ سمجھ کر بالا ارادہ فعل کرنے کی قوت ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ بُرے کرموں کا پھل بُرا ہی ہونا چاہیئے اور جب دوسرے

جہنم میں وہ بُرا پھل ہم کو ملا تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس بُرے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں؟ لامحالہ اس سے بُرے ہی اعمال صادر ہوں گے، اور پھر ان کا پھل تیسرے جہنم میں اور بھی زیادہ بُرا ہو گا۔ اس طرح بدکار انسان کی رُوح تنازع کے چکر میں نیچے سے نیچے طبقوں کی طرف ہی گرتی چلی جائے گی۔ اس کے پھر اُبھر کر آنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان سے حیوان تو بن سکتا ہے مگر حیوان سے انسان بننا غیر ممکن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جو لوگ اس وقت انسان ہیں وہ کس حُسنِ عمل کے نتیجے میں انسان ہوئے اور کہاں سے آئے؟

تمدن پر عقیدہ تنازع کا اثر

ان کے علاوہ اور بہت سے وجوہ ہیں جنکی بنا پر عقل سلیم تنازع کے اعتقاد کو قبول نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی جتنی ترقی کرتا گیا، تنازع کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب وہ زیادہ تر ان قوموں میں باقی رہ گیا ہے جو عقلی اور علمی ترقی میں بہت پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تنازع کا اعتقاد ہمتوں کو پست کرنے والا اور ترقی کی رُوح کو مُردہ کرنے والا اعتقاد ہے۔ اسی اعتقاد سے ”اہنسا“ کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کیلئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اس کی جنگی اسپرٹ فنا ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی قوتیں مضحل ہو جاتی ہیں۔ وہ قوائے جسمانی کو نشوونما دینے والی بہترین غذاؤں سے محروم

ہو جاتی ہے۔ اس کے افراد نہ صرف جسمانی اعتبار سے کمزور بلکہ
دماغی قوتوں کے لحاظ سے بھی ضعیف ہوتے ہیں۔ اس دوسرے
ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم مغلوب و محکوم ہو کر رہتی ہے
اور آخر کار یا تو صفحہ ہستی سے مٹ جاتی ہے یا دوسری طاقتور
قوموں میں جذب ہو جاتی ہے۔

حقیقۂ تنازع کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ تمدن و تہذیب کا
دشمن ہے اور انسان کو رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا
ہے۔ اہل تنازع کا اعتقاد ہے کہ رُوح کو جو چیز گناہوں سے آلودہ
کرتی ہے وہ خواہش ہے۔ اسی کی بدولت رُوح کو بار بار جسمانی
قالیوں میں آکر اپنے اعمال کے نتائج بھگتتے پڑتے ہیں۔ اگر انسان
خواہشات کو پامال کر دے اور اپنے آپ کو دنیا اور اس کے
دھندوں میں نہ پھنسائے تو اس کی رُوح کو آواگون کے چکر سے
نجات مل سکتی ہے، اور نجات کی بس یہی ایک صورت ہے۔
کیونکہ دنیوی زندگی کے معاملات میں پھنسنے کے بعد انسان کا
خواہشات اور ان کے مقتضیات سے بچ جانا محال ہے۔ اس کا
لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں۔ وہ سنیاسی بن
کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات
سے مایوس ہو کر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے
لئے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تخیل تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی
طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں
ترقی کر سکتی ہے؟

اس میں شک نہیں کہ بعض حیثیات سے تنازع کا اعتقاد کم از
کم اس سے بہتر ہے کہ موت کو فنائے محض اور عدم مطلق سمجھا

جائے۔ کیونکہ انسان میں بقائے دوام کی جو ایک فطری خواہش ہے وہ تنازع میں ایک حد تک تسکین پاسکتی ہے۔ اور اس کے ساتھ اس عقیدہ میں جزا و سزا اور اعمال کے اچھے اور بُرے انجام کا جو تخیل موجود ہے، اس کی بنا پر یہ ایک اچھے اور مضبوط اخلاقی قانون کے لئے پشت پناہ بھی بن سکتا ہے۔ لیکن اقل تو یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کی طرف ہم بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جو عقیدہ عقل اور علم کے خلاف اور تمدن و تہذیب کی ترقی میں مانع و مزاحم ہو، اس کی گرفت انسان کے دل و دماغ پر کبھی ایسی مضبوط نہیں ہو سکتی کہ وہ علمی و عقلی ارتقاء کے ہر مرتبہ اور ترقی تہذیب و تمدن کے ہر مرحلے میں یکساں قوت کے ساتھ قائم رہ سکے۔ اور جب اس کی گرفت قائم ہی نہیں رہ سکتی تو اس عقیدہ کا محض کتابوں میں ایک فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت سے موجود رہنا نظام اخلاق کے بقا و استحکام کے لئے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اس صورت میں نافع ہو گا جب کہ وہ کتابوں کے بجائے دلوں میں متمکن ہو اور لوگ پوری طرح اس پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ دوسرے یہ عقیدہ اپنے آخری نتیجہ کے اعتبار سے اپنی اخلاقی قیمت بھی کھو دیتا ہے کیونکہ جب کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ تنازع کا چکر بائیکل ایک مشین کی طرح چل رہا ہے، اور اس میں ہر فعل کا جو نتیجہ مقرر ہے وہ ظاہر ہو کر رہے گا، اور کسی توبہ و استغفار یا کفارے سے اس فعل کی تاثیر اور اس کے نتیجہ کو نہیں بدلا جاسکتا، تو ایک دفعہ گناہ کرنے کے بعد ایسا شخص ہمیشہ کے لئے گناہ کے پھیر میں آجائے گا، اور سمجھے گا کہ جب مجھے جانور یا درخت بننا ہی ہے تو کیوں نہ میں اس انسانی جون کی تمام لذتوں سے دل بھر کر فائدہ اٹھا لوں۔

حیاتِ اخروی کا عقیدہ

دُنیا اور انسان کے انجام پر دو مذہبوں کی رائیں آپ سُن چکے ہیں اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ دونوں مذہب نہ عقلاً صحیح ہیں، نہ ان فطری سوالات کا پورا پورا اور دل کو مطمئن کرنے والا جواب دیتے ہیں جو دُنیا میں زوال و فنا کے آثار کو دیکھ کر ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور نہ ان میں یہ صلاحیت ہے کہ ایک صحیح اور مضبوط اور اخلاقی نظام کے لئے پشت پناہ بن سکیں اب تیسرے مذہب کا بیان سنئے۔ وہ کہتا ہے:-

۱۔ جس طرح دُنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے، جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس پورے نظامِ عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبعی اس نظام کے قوانین طبعی سے مختلف ہوں گے۔

۲۔ اس نظام کے درہم برہم ہونے پر اللہ تعالیٰ عدالت قائم فرمائے گا جس میں ہر چیز کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی۔ وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو گا۔ اس کے تمام اعمال، جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے تھے، ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولدے جائیں گے۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائیگی۔

۳۔ انسان کی دُنوی زندگی دراصل اس کی اخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔

تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے۔ ہر بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بار آور نہیں ہو سکتا۔ اس نقص کی تکمیل اُسے دوسری زندگی میں ہوگی، اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمر رہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔ لہذا انسان کو اپنے اعمال و افعال کے محض اُن ناتمام اور بسا اوقات دھوکہ دینے والے نتائج ہی پر نظر نہ رکھنی چاہیئے جو اس دنیوی زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، اور نتائج کے اس مکمل سلسلہ کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے افعال کی قدریں متعین کرنی چاہئیں۔

یہ وہ مذہب ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور قرآن مجید اسی مذہب کا پُر زور وکیل ہے۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس مذہب کے اخلاقی نتائج اور تہذیب اسلامی میں اس کے رُتبے اور اہمیت پر کلام کریں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس مذہب کے دلائل کیا ہیں؟ اور عقل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

عقلی تحقیق کا صحیح طریقہ

یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں، اُن امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہمارے حواس اور حسی تجربہ کی حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص جو چند لمحہ قبل تک سانس لیتا اور اپنے ارادہ سے حرکت کرتا تھا وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گیا، اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شے غائب ہو گئی جس نے اس جامد، غیر نامی، غیر متحرک مادے کو نو اور حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شے کہاں چلی گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے یا

معدوم ہو گئی؟ اور پھر کبھی اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قائم ہو گا یا نہیں؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے، ہم اس سوال کا نفیاً یا اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس چیز کو فی نفسہ نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے ہیں۔ اس بنا پر یہ بات پہلے ہی سمجھ لینی چاہیئے کہ اس سوال کا سائنس، یعنی حکمتِ عملی یا تجربی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سائنس اگر اس پر اثباتاً کوئی حکم نہیں لگا سکتا تو نفیاً بھی کوئی حکم لگانے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ ”میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔“ لیکن اگر وہ خالص لا ادْرِیت کے مقام سے ہٹ کر یہ کہے کہ ”چونکہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ تو یقیناً معقولیت کی حدود سے تجاوز کر جائے گا۔

حواس کے بعد ہمارے پاس علم کا دوسرا ذریعہ ”تفکر“ ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے آپ کو محسوسات کے دائرے میں مقید رکھنے سے انکار کرتا رہا ہے، اور اس کی بشری فطرت کا مقتضاء یہی ہے کہ وہ غور و فکر کی قوتوں سے کام لے کر اُن پوشیدہ حقیقتوں کو معلوم کرے جو محسوسات سے ماوراء ہیں۔ اسی فکری جستجو کا نام ”تفکر“ ہے اور اس کے دو طریقے ہیں۔

ایک یہ کہ تم دُنیا اور خود اپنے نفس کے آثار و شواہد سے آنکھیں بند کر کے، یا ایک بڑی حد تک بے پروا ہو کر، خالص عقلی مقدمات سے نتائج اخذ کرنا شروع کرو، اور آخر تک عقل کے گھوٹے دوڑاتے چلے جاؤ۔ یہ خالص قیاسی فلسفے کا میدان ہے، اور تمام گمراہیوں

کی جولانگاہ یہی اندھیری منزل ہے۔ یہیں سے وہ فلسفیانہ مذاہب نکلے ہیں جن میں اُلجھ کر انسان تخیل کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جاتا ہے۔ یہیں سے خدا اور ملائکہ اور نظام عالم اور حیات بعد الموت کے متعلق وہ مختلف اور متضاد عقیدے نکلے ہیں جو محض اندھیرے میں ٹوٹنے اور وہم و گمان اور خُص و تخین پر چلنے کا نتیجہ ہیں۔

دوسرا طریقہ فکر یہ ہے کہ تم آنکھیں کھول کر کائنات میں اور خود اپنے نفس میں اُن آثار کا مشاہدہ کرو جو منزلِ حقیقت کے مشعلِ بردا ہیں، اور ان چراغوں کو لے کر عقل سلیم و فکرِ صحیح کی مدد سے اُن حقیقتوں تک پہنچو جو ان آثار کی تہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس دوسرے طریقے میں سائنس اور فلسفہ دونوں بل کر چلتے ہیں۔ اگرچہ حقیقت تک پہنچنے کا یقینی ذریعہ یہ بھی نہیں ہے۔ لیکن آسمانی ہدایت سے قطع نظر کہ انسان کے پاس حقیقت رسی کا واحد ذریعہ یہی ہے، اور اسے ذریعہ سے حقیقت تک یا اس کے قریب تک پہنچ جانا ممکن ہے، بشرطیکہ انسان کی قوتِ مشاہدہ تیز ہو، اس کی ادراکی قوتیں لطیف اور نازک ہوں، اور اس میں غور و فکر کی کافی صلاحیت موجود ہو حکمتِ نظری میں انسان کی ترقی کا مدار اسی مشاہدہ اور تفکر کی آمیزش پر ہے۔ آج جن نظریات پر حکمت کی بنیاد قائم ہے اور جن اصولوں پر ایمان لائے بغیر سائنس کا کوئی طالب علم ایک قدم بھی بچھے نہیں بڑھ سکتا، ان میں سے کوئی بھی محض تجربے اور مشاہدہ پر مبنی نہیں ہے۔ ہر نظریے اور ہر اصول کی بنیاد اُس قیاسِ عقلی پر قائم ہے۔ جس کے لیے مشاہدات و تجربات کو موادِ قیاس کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قانونِ فطرت، قانونِ جذب و کشش، سلسلہ علت و معلول، نظریہ اضافیت، قانونِ نشو و ارتقاء، قانونِ انتخابِ طبیعی اور ایسے ہی دوسرے

اُصول و قوانین جن پر بڑے بڑے اہل حکمت ایمان لائے ہیں، سب کے سب آثار و مظاہر کے مشاہدات پر غور و فکر اور عقلی قیاس آرائی کے استعمال کا نتیجہ ہیں۔ ورنہ آج تک کسی نے بھی ان قوانین اور ان اُصول کا حقیقی مشاہدہ نہیں کیا ہے

پھر جو نتائج ایک حکیم اپنے مشاہدے اور قیاس سے مستنبط کرتا ہے ان پر اسے اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا کسی عامی کو کسی شے کے حقیقی مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود کوئی بڑے سے بڑا حکیم بھی کسی منکر کو ان نتائج کے مان لینے پر مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ جب تک کوئی شخص آثار و مظاہر کا اس خاص نظر سے مشاہدہ نہ کرے جس سے حکیم نے مشاہدہ کیا ہے، اور اسی غور و فکر سے کام نہ لے جس سے حکیم نے کام لیا ہے، وہ ان نتائج پر کسی طرح نہیں پہنچ سکتا۔ ایک عامی کے لئے حکمت میں قدم رکھنے اور ترقی کرنے کی بس یہی صورت ممکن ہے کہ وہ جس حکیم کی دانائی و بصیرت پر اعتماد رکھتا ہو اس کے اخذ کردہ نتائج پر ایمان بالغیب لے آئے، بغیر اس کے کہ وہ خود اپنے مشاہدہ اور اپنے غور و فکر سے ان نتائج تک پہنچا ہو۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لیجئے، کیونکہ امور ماوراء طبیعت کے باب میں قرآن مجید کے بیان اور استدلال کو سمجھنے کے لئے اس مقدمہ کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ بہت سی غلط فہمیاں اسی کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

اب ہم کو حیاتِ اخروی کے متعلق قرآن مجید کے بیان کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

حیاتِ اُخروی پر منکرین کا اعتراض

حیاتِ اُخروی کا اعتقاد جب قرآن مجید نے پیش کیا تو اس کے خلاف اس وقت کے منکرین نے جو اعتراض کیا تھا وہ وہی تھا جو آج کے منکرین کرتے ہیں۔ اور درحقیقت اس پر یہی ایک اعتراض ممکن بھی ہے۔ یعنی یہ کہ مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا ایک بعید از عقل و قیاس بات ہے، ہم کس طرح مان لیں کہ جو مُردے زمین میں گل سڑ گئے، جن کے جسم خاک میں مل گئے، جن کے اجزائے جسم ہوا، زمین اور پانی میں منتشر ہو گئے ان کو پھر زندگی میسر ہوگی؟

وَقَالُوا إِذَا أَضَلَّلْنَا فِي الْأَرْضِ إِنَّا لَنُقِي خَلْقٍ

جَدِيدًا (السجده - ۱)

”اور انہوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا

ہم پھرتے سرے سے پیدا ہوں گے؟

وَقَالُوا إِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاقًا إِنَّا لَمَبْعُوثُونَ

خَلْقًا جَدِيدًا۔ (بنی اسرائیل - ۵)

”اور انہوں نے کہا کہ جب گل سڑ کر ہماری طرف ہڈیاں رہ

جائیں گی اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سر نو پیدا کر کے

اُٹھائے جائیں گے؟

وَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذَلِكَ مَا جَعَلُ بَعِيدًا۔

(ق - ۱)

”کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر جی اُٹھیں گے؟ یہ

والہی تو بعید از قیاس و عقل ہے۔“

مَنْ يَتَّبِعِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ۔ (آلین - ۵)

”کون ہے جو ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو

پہنکی ہوں؟

قرآن مجید کا طرز استدلال

اس شبہ کے مقابلہ میں قرآن مجید نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدرت الہی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور کرنے کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ
حَتَّىٰ يَتَّبِعِنَا لَهُمْ آتَاءُ الْحَقِّ۔ (ثم السجده-۶)

”ہم ان کو آفاق میں اور خود ان کے اپنے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔“
أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ۔
(اعراف-۲۳)

”کیا وہ آسمانوں اور زمین کے انتظام پر غور نہیں کرتے؟“
وَكَايِنِ مِّنْ آيَاتِنَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ۔
(یوسف-۱۲)

”آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے وہ

اس طرح گزر جاتے ہیں کہ ان پر غور ہی نہیں کرتے۔“

یہ اشارہ ہے اس طرف کہ تم کو اتنی قوت تو نہیں دی گئی ہے کہ جو چیز تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اس کو تم برائی العین مشاہدہ کر سکو، یا کسی تجربہ سے اس کی حقیقت معلوم کر سکو۔ البتہ اگر تم آنکھیں کھول کر اُن آثار کو دیکھو جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاہدہ کرو، اور

تو اپنے نفس کی پیدائش پر غور کرو، اور ان سب محسوسات و مشاہدات پر غور و فکر کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو، تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے

حیاتِ آخری کا امکان

پھر وہ انہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب سے زیادہ بدیہی ہیں، اور ان سے یہ استدلال کرتا ہے کہ جس بات کو تم بعید از عقل و قیاس سمجھ رہے ہو، وہ چاہے تمہاری عقل و قیاس سے دُور ہو، مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے۔

اللَّهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ
تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ وَمَنْحَرًا لِّلشَّمْسِ
وَالْقَمَرِ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَايِرُ الْأَمْرَ
يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ بَلَقَاءِ رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ۔

(الرعد-۱)

”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو ایسے ستونوں کے بغیر بلند کر رکھا ہے جو تم کو نظر آسکیں۔ پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا، اور اس نے سورج اور چاند کو اپنا تابع فرمان کیا۔ ان میں سے ہر ایک ایک مدت مقررہ تک کے لئے حرکت کر رہا ہے وہی تمام عالم کا انتظام کرتا ہے اور وہ اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات پر یقین لاؤ۔“

وَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا۔

(النازعات-۲)

”کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ خدا نے

تو (ایسی بڑی چیز) کو بنایا ہے۔“

یہ اجرام سماوی کے آئینہ سے استشہاد ہے کہ جس خدا نے اتنا بڑا نظام کائنات پیدا کیا ہے، جس نے بڑے بڑے ستاروں کو اپنے قانون کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے، جس کی قدرت ان عظیم اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا، نہ اپنے مقررہ اوقات سے پل بھر کے لیے ہٹ سکتا ہے، اور جس طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایسے غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے۔ جن کے ادراک سے تم عاجز ہو، اُس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے، کیسی بڑی خام خیالی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ۔

(بنی اسرائیل۔ ۱۱)

”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو

پیدا کیا ہے وہ ان جیسوں کو بھی پیدا کرنے پر قادر ہے۔“

آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول، یعنی زمین کے آئینہ کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے۔

سَيَّرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ
الْخَلْقَ ثُمَّ اللَّهُ يُنشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ إِنَّ اللَّهَ
عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (العنکبوت۔ ۲)

”زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ نے کس طرح آفرینش کی

اہتمام کی ہے اور پھر وہی اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی بخش رہا ہے

یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

وَإِنَّمَا لَهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا
وَآخَرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَبِتُّ يَأْكُلُونَ۔ (یس۔ ۳)

”اور ان کے لئے ایک نشانی تو مردہ زمین ہی ہے جس کو ہم نے زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ لوگ کھاتے

ہیں۔“

فَانْظُرْ إِلَى آثَارِ رَحْمَةِ اللَّهِ كَيْفَ يُحْيِي الْأَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ ذَلِكَ لَمُعْجَى الْمَوْثَى وَهُوَ عَلَى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (الروم۔ ۵)

”پھر اللہ کی رحمت کے آثار دیکھ کہ کس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی ہے۔ یقیناً وہ ضرور مردوں کو بھی زندگی عطا کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

وَمِنْ آيَاتِهَا أَنْتَ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً
فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي
أَحْيَاهَا لَمُعْجَى الْمَوْثَى إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

(حکم السجدہ۔ ۵)

”اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سونی پڑی ہے۔ پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ بھیگ اٹھی اور ہلہلانے لگی۔ تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے۔ یقیناً وہ ہر چیز پر

قادر ہے۔“

وَاللَّهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيحَ فَتُشِيرُ
سَحَابًا فُسُقَتْ إِلَى بَلَدٍ مَيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا

بِإِلَآءِ أَرْضٍ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذَآلِكَ النُّشُورُ۔

(فاطر-۲)

”اور وہ اُٹھتی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے، پھر وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ہم ان بادلوں کو ایسی بستی کی طرف ہانکتے ہیں جو بے آب و گیاہ پڑی ہے، پھر اس مُردہ پڑی ہوئی زمین کو بارش کے ذریعہ سے زندہ کر دیتے ہیں۔ بس ایسا ہی جی اُٹھنا قیامت میں بھی ہوگا۔“

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے ذرا خود اپنے نفس پر تو غور کرو کہ خود تمہارے اندر ہی خدا کے اچانک موقیٰ پر قادر ہونے کا ثبوت موجود ہے۔

هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ
لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا۔ (الدمر-۱)

”بلاشبہ انسان پر زمانہ کا ایک ایسا وقت گزرا ہے جب کہ

وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔“

كُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُبَيِّنُكُمْ ثُمَّ
يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيَّا تُرْجَعُونَ۔ (البقرہ-۳)

”تم مُردہ تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا، پھر وہ تم کو مُردہ کر دے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

إِن كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ
مِّن نُّرَابٍ۔ (الحج-۱)

”اگر تم کو مرنے کے بعد جی اُٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی جیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا

ہے

قَالَ مَنْ يَحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ قُلْ
يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ - (یس۔ ۵)

”اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ
ہو جائیں گی؟ کہہ دے کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے انہیں
پہلی بار زندگی بخشی تھی۔“

قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا أَوْ خَلْقًا مِمَّا
يَكْبُرُ فِي صُدُوقِكُمْ فَسَيَقُولُونَ مَنْ يُعِيدُنَا
قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ - (نبی اسرائیل۔ ۵)

”ان سے کہو کہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی اور ایسی چیز جس
کا زندہ ہونا تمہارے نزدیک بہت ہی بعید از عقل ہو، پھر وہ پوچھیں
کہ کون ہم کو دوبارہ زندہ کرے گا؟ تو کہو کہ وہی جس نے پہلی
بار تم کو پیدا کیا تھا۔“

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ
طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَكِينٍ ثُمَّ
خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً
فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ غِطَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا
ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ
الْخَالِقِينَ ثُمَّ إِنَّكُمْ بَعْدَ ذَلِكَ لَمَيِّتُونَ ثُمَّ
إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ تَبْعَثُونَ - (المومنون۔ ۱)

”ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر ہم نے ہی اس
ست کو نطفہ بنا کر ایک حفاظت کی جگہ میں رکھا، پھر نطفہ کو لوتھر بنا دیا،
پھر لوتھر کو مضغہ گوشت کی صورت دی، پھر مضغہ کی ہڈیاں

بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اس کو ایک دوسری ہی چیز بنا کر اٹھا کیا۔ پس بڑی برکت والا ہے اللہ جو بہترین خالق ہے پھر اس کے بعد تم ضرور مرنے والے ہو، پھر یقیناً تم قیامت کے روز اٹھائے جاؤ گے۔“

الْحَرِيكَ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيَّيْ ثُمَّ كَانَ
عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَدِيرًا عَلَىٰ أَنْ يُخْطِيَ
السَّوْءَىٰ۔ (القيسہ - ۲)

”کیا انسان منی کا محض ایک قطرہ نہ تھا جو رحم مادر میں ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا۔ پھر خدا نے اس کو انسانی شکل دی۔ اور اس کی ساخت کو استوار کیا۔ پھر اس کی دو صفیں کر دیں کر دیں اور مرد و عورت کے جوڑے بنائے۔ کیا وہی خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کرے؟“

یہ صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد قرآن مجید ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل عقل عام (Common Sense) سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دُشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آ سکتی ہے کہ وہ موٹر کے پُرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ ان کو

جوڑ دینے پر قادر نہیں ہے؛ اسی مثال پر قیاس کر لو کہ صالح عالم جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے، تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ۔ (العنکبوت-۲)
 ”کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اللہ کس طرح آفرینش کی ابتداء کرتا ہے؟ پھر اسی طرح وہ اس کا اعادہ بھی کرے گا اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے لئے یقیناً زیادہ آسان ہے۔“

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ۔ (الروم-۳)

”اور وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتداء کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس کے لئے سہل تر ہے۔“

أَفَعَيَيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ، بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ۔ (ق-۱)

”کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز ہوئے تھے؟ (نہیں،) ان کو پہلی آفرینش سے انکار نہیں ہے) مگر ان کو ایک نئی آفرینش میں شک ہے۔“

اب صرف یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ جن مردوں کے اجزائے جسم فنا ہو گئے ان کو پھر کیوں کر پہلا جسم عطا کیا جاسکتا ہے؟ کوئی پانی میں ڈوب کر مرا اور اس کی بوٹی بوٹی پھلیوں اور آبی جانوروں کی غذا بن گئی۔ کوئی جل کر مرا یا مر کر جلا دیا گیا اور اس کا سارا جسم راکھ اور دھوئیں میں منتقل ہو گیا۔ کوئی زمین میں دفن ہوا اور خاک میں

زل مل گیا۔ اب کیونکر ممکن ہے کہ اس کا پہلا جسم خود کرے اور اس میں پھر وہی پہلی رُوح پھونکی جائے؟ اس شبہ کو لوگوں نے یہ کہہ کر دفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ رُوح کو جسمانی زندگی عطا کرنے کے لئے لازم نہیں ہے کہ وہی پہلا جسم اس کو واپس دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ رُوح وہی ہو اور اس کو پہلے جسم کے مشابہ کوئی دوسرا جسم عطا کر دیا جائے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ خدا وہی جسم عطا کرنے پر قادر ہے۔ پہلے جسم کے اجزاء معدوم نہیں ہوئے ہیں۔ منتشر حالت میں اس کا ہر ہر جز کہیں نہ کہیں موجود ہے، خواہ ہوا میں ہو، خواہ پانی میں ہو، خواہ مٹی میں ہو، خواہ نباتات یا حیوانات کے اجسام میں ہو۔ خواہ معدنیات کے اجرام میں ہو۔ خدا کا علم اتنا حاوی ہے کہ وہ ہر جز کے مقام کو جانتا ہے اور اس کی قدرت اتنی کامل ہے کہ وہ ان منتشر اجزاء کو پھر جمع کر کے پہلی صورت پر بنا سکتا ہے۔

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِندَنَا

كِتَابٌ حَفِیْظٌ (ق۔ ۱)

”ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان میں سے کیا چیز گھٹانی ہے اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جس میں ہر چیز کا ریکارڈ محفوظ ہے۔“

وَعِنْدَنَا مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ
وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْتَعْجِلُ مِنْ
وَرَاقِبًا إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حِجَّةَ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ
وَلَا رَاطِبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ

(الانعام)

”اور اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کا علم اس کے سوا
 کسی کو نہیں ہے۔ جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اس کو سب معلوم
 ہے۔ ایک پتہ بھی اگر جھڑتا ہے تو وہ اس کو جانتا ہے۔ زمین
 کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے، اور کوئی خشک و
 تر چیز ایسی نہیں ہے جو واضح کر کے دکھا دینے والی ایک کتاب
 میں موجود نہ ہو۔“

یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا مقصد اس استبعاد کو دور کرنا ہے
 جس کی بناء پر لوگ حیاتِ اخروی سے انکار کرتے ہیں۔ انکار کی
 اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ منکرین کو کسی تجربہ یا مشاہدہ یا علم یقین
 کے کسی اور ذریعہ سے قطعاً و اجاباً یہ معلوم ہو گیا ہے کہ مرنے کے
 بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ انکار صرف اس بناء پر ہے کہ
 مرنے کے بعد پھر جی اٹھنا اُن کی عقل میں نہیں سماتا۔ انہوں نے
 اس نظارہ کو کبھی نہیں دیکھا۔ ان کو تو یہ دیکھنے کی عادت رہی ہے
 کہ جو مراسو پھر نہ پلٹا۔ لہذا جب یہ کہا جاتا ہے کہ جو مر چکے ہیں وہ پھر
 پلٹیں گے تو اس خلافِ عادت بات کو وہ محال، غیر ممکن اور بعید
 از عقل و قیاس سمجھتے ہیں۔ لیکن غور و فکر کی راہ میں ایک قدم آگے
 بڑھئے۔ یہ سارا استبعاد دور ہو جاتا ہے اور جو بات پہلے ناممکن
 نظر آتی تھی وہ عین ممکن نظر آنے لگتی ہے۔ جن باتوں کو آپ ممکن
 بلکہ واقعی سمجھتے ہیں اُن کے متعلق آپ کا ایسا سمجھنا محض اس وجہ
 سے ہے کہ آپ کو ان کے وقوع کا مشاہدہ کرنے کی عادت رہی
 ہے۔ ایک بیج کا زمین میں جا کر پھوٹنا اور ایک تناور درخت کی شکل
 میں نمودار ہو جانا، ایک قطرہ کا رجم میں پہنچنا اور وہاں سے ایک
 انسان کی شکل میں برآمد ہونا، دو ہواؤں کے مجموعے سے پانی بننا

اور اس کا ایک ترتیب کے ساتھ بار بار پانی سے بھاپ اور بھاپ سے پانی بنتے رہنا، عالم کی اس وسیع فضاء میں کروڑ ہا کروڑ ستاروں کا گیندوں کی طرح دوڑنا اور کسی مادی رشتے کے بغیر ایکٹ کا دوسرے کے ساتھ ایسا مربوط ہونا کہ ان کی حرکات اور گردشوں کے نظم میں ذرہ برابر فرق نہ آئے، یہ سب باتیں دیکھنے کے آپ خوگر ہیں اس لئے ان کو معمولی سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر یہی چیزیں آپ کے سامنے پیش نہ ہوتیں اور اس کے بجائے کسی اور نظام سے آپ مانوس ہوتے، تو انہی سب باتوں کو آپ اتہام سے زیادہ بعید از عقل و قیاس سمجھتے، اور شدت کے ساتھ ان کے امکان سے انکار کرتے۔ فرض کیجئے کہ کرۂ مرتخ میں درخت نہ اُگتے ہوں اور وہاں کے لوگوں سے بیان کیا جائے کہ ایک ماشہ بھر کا بیج زمین میں دفن ہو کر درخت بنتا ہے، اور اپنے ابتدائی جرم سے کئی سے ہزار بلکہ کئی لاکھ گنا بڑا ہو جاتا ہے، اور پھر اس میں سے ویسے ہی ہزاروں بیج پیدا ہوتے ہیں، تو یہ بات مرتخ والوں سے کسے نگاہوں میں اتنی ہی حیرت انگیز ہوگی جتنی آپ کے نزدیک مرنے کے بعد پھر جی اٹھنے کی داستان حیرت انگیز ہے۔ وہ بھی اسی طرح کہیں گے کہ یہ تو ناممکن ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ عدم امکان کا فتویٰ علم کی بنا پر نہیں جہل کی بنا پر ہوگا۔ عقل کی رسائی کا نتیجہ نہیں نارسائی کا نتیجہ ہوگا۔ بس ایسا ہی حال آپ کے استبعاد کا ہے۔ اگر آپ اپنے استعجاب یا استبعاد کی حقیقت کو سمجھ لیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ کسی چیز کا آپ کی عقل و قیاس سے دور ہونا درحقیقت اس چیز کے غیر ممکن یا محال ہونے کے لئے کوئی دلیل ہی نہیں ہے۔ جو چیزیں آج خود انسان ایجاد کر رہا ہے وہ آج

سے سو برس پہلے خود انسان کے نزدیک بعید از عقل و قیاس تھیں۔ مگر واقعات سے ثابت ہو گیا کہ ناممکن نہ تھیں۔ اسی طرح جن چیزوں کو آج انسان مستبعد سمجھ رہا ہے وہ آج سے سو دو سو برس بعد خود انسان کے ہاتھوں وجود میں آئیں گی اور واقعات ثابت کر دیں گے کہ وہ ناممکن نہیں ہیں۔ پھر جب انسان کی عقل اور اس سے بعید یا قریب ہونے کی حقیقت یہ ہو تو کسی چیز کو محض اس بنا پر ناممکن نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اس محدود عقل میں نہیں سماتی۔

کسی محقق اور ماورائے ہوا اس چیز کو ثابت کرنے کے لئے پہلا قدم یہی ہے کہ اس کا امکان ثابت کیا جائے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اپنے استدلال سے حیاتِ اخروی کے استبعاد کو دور کر کے اس کو ممکن ثابت کر دیا۔ اب دوسرا قدم یہ ہے کہ اس کی ضرورت ثابت کی جائے تاکہ عقل یہ تسلیم کرے کہ ایسی ایک چیز ضرور ہونی چاہیئے اور اس کے عدم سے اس کا وجود اولیٰ ہے۔

نظامِ عالم ایک حکیمانہ نظام ہے

حیاتِ اخروی کی ضرورت کا اثبات دراصل اس سوال کے تصفیہ پر موقوف ہے کہ آیا یہ کائنات کسی حکیم کا فعل ہے یا بلا کسی حکمت کے آپ سے آپ بن گئی ہے؟

زمانہء حال کا سائنس زدہ انسان کہتا ہے کہ اس نظام کو کسی صنّاعِ حکیم نے نہیں بنایا۔ یہ آپ سے آپ بن گیا ہے اور خود بخود حرکت کرنے والی مشین کی طرح اپنے تمام اجزاء سمیت (جن میں انسان بھی شامل ہے) چل رہا ہے۔ مادہ اور توانائی (Energy) کا باہمی تعامل جس روز ختم ہو جائے گا اسی روز یہ نظام بھی دُور

برہم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا نظام، جس کو ایک اندھی طبیعت (Nature) بلا کسی علم، عقل، شعور، ارادہ اور حکمت کے چلا رہی ہے، اس میں کسی مقصدیت اور حکمت کی تلاش بے فائدہ رہے گی۔ اسی وجہ سے مادہ پرست سائنس نے آثار کائنات کی مقصدی تعلیل (Teleological Causation) کو اپنے حدود سے نہ صرف خارج کر دیا ہے، بلکہ اس طریق فکر کو سرے سے لغو و بے معنی قرار دیا ہے، اور قطعیت کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ اس کائنات اور اس کی کسی شے اور کسی فعل میں کوئی مقصد نہیں پایا جاتا۔ آنکھیں دیکھنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ دیکھنا نتیجہ ہے مادہ کی اس خاص تنظیم کا جو آنکھوں میں پائی جاتی ہے۔ دماغ اس لیے نہیں ہے کہ سوچنے اور فکر و شعور کا محل بنے، بلکہ خیالات و مبالغہ کے مادے سے اسی طرح نکلتے ہیں جس طرح جگر سے صفراء نکلتا ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے کہ اشیاء کے طبیعی افعال کو ان کا مقصد قرار دیا جاتا ہے اور ان کے وجود میں کسی حکمت اور کسی عقل کی جستجو کی جاتی ہے۔

اس نظریہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو حیاتِ دنیوی کے بعد کسی حیاتِ اُخروی کی ضرورت تسلیم کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں رہتی۔ کیونکہ جس کائنات کا نظام ایک اندھی بے عقل و شعور طبیعت کے ہاتھوں کسی مقصد و غایت کے بغیر چل رہا ہے، اس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اور اس کی ہر شے عبث و بیهوده بنی ہے اور عبث ہی تمام ہو کر فنا ہو جائے گی۔ یہ مستبعد ہے کہ ایسی اندھی طبیعت عدل کی صفت سے متصف ہو اور اس سے کسی حساب کتاب اور انصاف کی امید کی جائے۔ تاہم اگر بالفرض

وہ عدل سے متصف ہو بھی، تو جب کہ انسان اس کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے کی طرح کھیل رہا ہے اور اپنے اختیار سے کچھ کرنا تو درکنار سرے سے کوئی اختیار اور کوئی ارادہ رکھتا ہی نہیں، اُس پر اپنے کسی اچھے یا بُرے فعل کی اُسی طرح کوئی ذمہ داری نہیں ہونی چاہیئے جس طرح ایک موٹر پر اپنی راست روی یا کج روی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اور ذمہ داری کا سوال اُٹھ جانے کے بعد دُنیا ہی میں عدل و انصاف اور جزا و سزا کا سوال منقطع ہو جاتا ہے، کجا کہ اس کی خاطر ایک دوسری زندگی کی ضرورت تسلیم کی جائے۔ لیکن یہ نظریہ سراسر خلاف عقل ہے، اور کوئی عقلی دلیل یا علمی شہادت ایسی نہیں پیش کی گئی جس سے اس کی صداقت ثابت اور مبرہن ہو جائے۔ اس کی تائید میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا کُلبِ لباب بس اتنا ہے کہ ہم کو کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا اور کوئی چلانے والا نظر نہیں آتا۔ نہ اس کی پیدائش کا کوئی مقصد، ہماری سمجھ میں آتا ہے ہم اس کو کسی بنانے والے کے بغیر چلتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کے چلنے کا مقصد معلوم کرنا نہ ہمارے لئے ممکن ہے، نہ ہم کو اس کے معلوم کرنے کی ضرورت۔ لیکن کسی شے کی علتِ فاعلی اور علتِ غائی نہ معلوم ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ اس کی کوئی علتِ غائی اور علتِ فاعلی ہے ہی نہیں۔ فرض کرو کہ ایک بچہ کسی مطبع کے مشین کو چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ مشین کس غرض سے چلائی گئی ہے۔ اس بنا پر وہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض ایک کھلونا ہے جو بلا کسی مقصد و غایت کے چل رہا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ جس طرح اس مشین سے آواز پیدا ہوتی ہے، پُرزے حرکت کرتے ہیں، زمین لرزتی ہے، اسی طرح کاغذ بھی چھپ چھپ کر نکلتے ہیں۔

اس بنا پر وہ حکم لگاتا ہے کہ جس طرح وہ افعال اس مشین کے چلنے کے نتائج ہیں اسی طرح کاغذوں کا چھپ چھپ کر نکلنا بھی اس کی حرکت کا ایک طبیعی نتیجہ ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ تمام افعال جو اس سے صادر ہو رہے ہیں ان میں سے صرف ایک فعل، یعنی کاغذوں کا چھپ کر نکلنا، اس پوری مشین کے بنائے جانے کا مقصد ہے، اور باقی تمام افعال مشین کی حرکت کے طبیعی نتائج ہیں۔ اُس کی طفلانہ نظر مشاہدہ کی اتنی قوت نہیں رکھتی کہ اس مشین کے پُروزوں میں ترتیب، تناسب اور نظم کو محسوس کر سکے، اور یہ سمجھ سکے کہ اس کا ہر پُروزہ جس صورت پر بنایا گیا ہے، اور جس مقام پر لگایا گیا ہے، وہی صورت اور وہی مقام اس کے لئے موزوں ہے اور مشین میں اپنے حصہ کا کام انجام دینے کے لئے وہ پُروزہ اسی صورت کا اور اسی مقام پر ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر وہ کند ذہن بچہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مشین یوں ہی لوہے کے ٹکڑوں کے باہم مل جانے سے آپ ہی آپ بن گئی ہے۔ اس کی عقلی قوتیں اتنی ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ وہ مشین کے افعال اور اس کی ترتیب کو دیکھ کر قیاس کر سکے کہ اس کا بنانے والا ضرور کوئی حکیم شخص ہے ہوتا چاہیئے جس نے ایسے اچھے اندازے، اور ایسے عمدہ نقشے پر ایسی مشین بنائی ہے جس کا کوئی پُروزہ بے کار، غیر موزوں، غیر منضبط اور بے ضرورت نہیں ہے، اور یہ کہ ایسی حکمت و دانائی کیساتھ جو چیز پیش کی گئی ہے وہ ہرگز بے مقصد، بے مصلحت اور عبث نہیں ہو سکتی۔ اب اگر پریس مشین کے اس ناقص مشاہدے اور اس پر اپنے ناقص غور و فکر سے وہ نادان بچہ یہ نظریہ قائم کرتا ہے کہ مشین کی کوئی علتِ فاعلی اور علتِ غائی نہیں ہے، نہ کوئی

حکمت اس کے بنانے میں صرف ہوئی ہے، اور نہ کوئی حکیمانہ مقصد اس کی صنعت میں پیش نظر ہے، تو کیا کوئی عاقل و بالغ آدمی یہ تسلیم کرے گا کہ بچہ نے اس مشین کی حقیقت کے متعلق ایک صحیح نظریہ قائم کیا ہے؟

اگر یہ بات ایک پریس مشین کے معاملے میں درست نہیں ہے تو اس نظام کائنات کے معاملہ میں کیوں کر درست ہو سکتی ہے جس کا ایک ایک ذرہ اپنے صانع کے علم، ارادے، حکمت، اور بصیرت پر شہادت دے رہا ہے۔ ناقص العقل اور کوتاہ ہیں۔ بچہ جو چاہے کہے، مگر کوئی صاحب عقل آدمی تو، جس نے آنکھیں کھول کر اس کائنات کے آثار کا مشاہدہ کیا ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی یہ شک نہیں کر سکتا کہ ایسا محکم، استوار، مرتب اور متناسب نظام جس میں کوئی شے بے کار اور عبث نہیں ہے، جس میں کوئی شے ضرورت سے کم یا زیادہ نہیں ہے، جس کا ہر جز اپنے مقام اور اپنی ضرورت کے لحاظ سے ٹھیک ٹھیک موزوں ہے، اور جس کے ضابطہ میں کہیں کوئی فتور نظر نہیں آتا، کسی حکمت، کسی علم، کسی ارادے کے بغیر بن اور چل سکتا ہے۔

حکیمانہ نظام بے مقصد اور بھل نہیں ہو سکتا

قرآن مجید نے حیاتِ اخروی کی ضرورت پر جو دلائل قائم کیے ہیں وہ سب اسی بنیادی نظریہ پر مبنی ہیں کہ اس کائنات کا بنانیوالا ایک حکیم ہے جس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے، اور جس کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جاسکتی جو خلاف حکمت ہو۔ اس بنیاد کو استوار کرنے کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ:-

أَفَصَبِّتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَتَّكُم

إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ فَتَعَالَى اللَّهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ

(المومنون - ۴)

”کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف واپس نہ لائے جاؤ گے؟ بادشاہ برحق خدا اس سے بالاتر ہے (کہ اس سے کوئی فعل عبث صادر ہو۔)“

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى

(القيّمہ - ۲)

”کیا انسان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟“

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
لِالْعَيْنِ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ - إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ
أَجْمَعِينَ - (الدخان - ۲)

”ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے تو ان کو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یقیناً ان سب کے لئے فیصلہ کے دن تک کا وقت مقرر ہے۔“

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللَّهُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَ
أَجَلٍ مُّسْتَقَرٍّ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ بِإِلْقَائِ
رَبِّهِمْ لَكَفِرُونَ - (الروم - ۱)

”کیا انہوں نے خود اپنے دلوں میں غور نہیں کیا کہ اللہ نے
آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو جو پیدا کیا
ہے تو حکمت کے مطابق کیا ہے اور ان کے لئے ایک وقت
مقرر ہے ؟ مگر بہت سے آدمی ہیں جو اپنے رب کی ملاقات
کے منکر ہیں۔“

ان آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا یہ سارا
کارخانہ صرف اس لئے ہے کہ ایک مدت تک چلتا رہے، پھر کسی
حاصل اور نتیجہ کے بغیر معدوم ہو جائے، تو یہ ایک لغو اور عبث
فعل ہوگا، ایک کھیل ہوگا۔ ایسا فعل ہرگز کسی حکیم کا فعل نہیں ہو سکتا۔
اگر تم مانتے ہو کہ یہ کارخانہ خدا نے بنایا ہے اور خدا تمہارے نزدیک
حکیم ہے، تو تم کو عقل سے کام لے کر یہ سمجھنا چاہیے کہ موجودات
میں سے کوئی شے بے مقصد وجود میں آنے والی اور بے حاصل و
بے نتیجہ معدوم ہو جانے والی نہیں ہے۔ خصوصاً انسان جو کائنات
ارضی کا مکمل سرسبد ہے، جس کی ذی شعور ہستی اس کائنات ارضی کے
تدریجی ارتقاء اور اس کی تمام حرکات و تحولات کا حاصل ہے، جس کو
اتنی حکمت کے ساتھ عقل و فکر اور بینش و دانش اور اختیار و ارادہ کے
آراستہ کیا گیا ہے، اس کی تخلیق کا مقصد اتنا مہمل نہیں ہو سکتا کہ وہ
چند برس اس دنیا میں ایک مشین کی طرح بسر کرے، پھر مکرر معدوم
ہو جائے۔

اقتضائے حکمت کی مطابق نظام عالم کا کیا انجام ہونا چاہیے
جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ یہ کائنات عبث اور کھیل نہیں ہے،
اور نہ اس کی کوئی شے بے نتیجہ و بے حاصل ہے، تو دوسرا سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ عدم مطلق کے سوا اس کارخانے کا اور کون سا انجام

ایسا ہے جو اقتضائے حکمت کے عین مطابق ہو؟ اس سوال کا تفصیلی جواب قرآن مجید کی آیات میں موجود ہے، اور وہ ایسا جواب ہے جس کو سننے کے بعد عقل سلیم بالکل مطمئن ہو جاتی ہے۔ مگر اس جواب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے چند امور ذہن نشین کر لیے جائیں:-

۱۔ عالم وجود کے تمام آثار اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ اس نظام کے جتنے تغیرات و تحولات ہیں ان سب کا رخ ارتقاء کی جانب ہے۔ اس کی ساری گردشوں کا مقصود یہ ہے کہ یہ نقص کو کمال کی طرف لے جائیں، اور اشیاء کی ناقص صورتوں کو مٹا کر انہیں کامل اور کامل سے کامل تر صورتیں بخشیں۔

۲۔ اس قانون ارتقاء کا عمل چونکہ تغیر کی روش پر ہوتا ہے۔ اس لئے ہر کون کے لئے ایک فساد ضروری ہے۔ ایک صورت کا وجود میں آنا اس کا مقتضی ہے کہ پہلی صورت فاسد ہو جائے، اور ناقص صورت کا زائل ہونا کامل تر کے وجود میں آنے کا دیرپا چہ ہوا کرتا ہے۔ یہ تغیرات و استحالات اگرچہ ہر آن ہوتے رہتے ہیں، لیکن بہت سے خفی تغیرات کے بعد ایک جلی اور نمایاں تغیر واقع ہوا کرتا ہے جس میں ایک جلی اور نمایاں فساد پیش آتا ہے۔ یہی دوسری قسم کا فساد ہے جس کو ہم عرف عام میں موت یا زوال سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک صورت کے وجود میں آنے سے لے کر اس کی موت یا اس کے قطعی فساد تک ایک وقفہ ہوتا ہے جس کو ہم اپنی زبان میں عمر کہتے ہیں۔

۳۔ ہر صورت اپنے لئے ایک خاص محل چاہتی ہے جو اس کے مناسب حال ہوا کرتا ہے۔ کوئی صورت کسی ایسے محل میں نہیں رہ

سکتی جو اس کے لئے مناسب حال نہ ہو۔ مثلاً صورتِ نباتی کے لئے حیوانی جسم غیر مناسب ہے، اور صورتِ انسانی اسی جسم اور اسی مخصوص طور کے نظامِ جسمانی کی طالب ہے جو انسان کے لئے بنایا گیا ہے۔ پس اگر کسی شے کو ایک ترقی یافتہ صورت دینی ہو تو لازم ہے کہ فروتر درجہ کی صورت کے لئے جو محل بنایا گیا تھا اس کو توڑ دیا جائے، اور نئی صورت کے لئے اس کے مناسب حال محل تیار کیا جائے۔

۴۔ اجزائے عالم کے حق میں قانون ارتقاء کی ہمہ گیری کو جس شخص نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے اس کے نزدیک یہ بات ہرگز مستبعد نہیں ہے کہ یہی قانون اس پورے نظامِ عالم پر بھی حاوی ہو۔ اس وقت جو نظامِ عالم ہم دیکھ رہے ہیں، اس کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب سے خلق و ابداع کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس سے پہلے نہ معلوم کتنے اور نظامات گزر چکے ہوں گے جن میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی عمر پوری کر کے دوسرے ترقی یافتہ نظام کے لئے جگہ خالی کر دی، اور ارتقاء کے تدریجی مراتب سے گزر کر سلسلہ وجود ہمارے اس نظام تک پہنچا۔ اسی طرح یہ نظام بھی کوئی آخری نظام نہیں ہے یہ بھی جب اپنے امکانی کمالات کو پہنچ جائے گا، اور کمال کے بالاتر درجہ کو قبول کرنے کی استعداد اس میں باقی نہ رہے گی، تو اس کو توڑ دیا جائے گا اور اس کے بجائے کوئی دوسرا نظام قائم کیا جائے گا جس کے قوانین کچھ اور ہوں گے، اور جس میں وجود کے کامل تر مراتب قبول کرنے کی صلاحیت ہوگی۔

۵۔ عالم کے موجودہ نظام پر غور کرنے سے ہم کو یقین طور پر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایک ناقص نظام ہے اور مزید تکمیل کا

محتاج ہے۔ اس نظام میں اشیاء کی حقیقتیں مادی آلائشوں سے اس درجہ آلودہ ہیں کہ حقیقتوں نے اوہام کا اور ان کے مادی لباسوں نے حقیقتوں کا مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ لطیف اور مادی آلائشوں سے مجرب ہے وہ اس نظام عالم میں اتنی ہی زیادہ مخفی و مستور، اور عقل و شعور کی دسترس سے دور ہے۔ یہاں ٹھوس مادی جسم وزن رکھتا ہے اور لطیف و بسیط حقائق کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہاں بکری اور پتھر ناپے اور تولے جاسکتے ہیں، مگر عقل و فکر، خیال و رائے، نیت و ارادہ، جذبات و وجدانات کو ناپنے اور تولنے کے لئے اس عالم کے قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں غلہ تولاجا سکتا ہے، مگر محبت اور نفرت کو تولنے والا کوئی ترازو نہیں ہے۔ یہاں کپڑا ناپا جاسکتا ہے، مگر بغض و حسد کو ناپنے کے لئے کوئی پیمانہ موجود نہیں۔ یہاں روپے پیسے کی قدریں متعین کی جاسکتی ہیں، مگر اس جذبے کی قدر و قیمت متعین کرنا ممکن نہیں ہے جو سخاوت یا بخل کے لئے محرک ہوتا ہے۔ یہ اس عالم کے نظام کا نقص ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ اس سے زیادہ ترقی یافتہ کوئی اور نظام ہو جس میں حقیقتیں مادی لباسوں کی محتاج نہ رہیں اور بے نقاب جلوہ گر ہو سکیں۔ جس میں لطافتیں کثافتوں پر غالب آجائیں اور جو کچھ اب مستور و مخفی ہے وہ نمایاں اور جلی ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی اس عالم کا نقص ہے کہ یہاں مادی قوانین کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے افعال کے صرف وہی نتائج مترتب ہوتے ہیں جو مادی قوانین کے مقتضیات سے مطابقت رکھتے ہوں، اور ایسے نتائج مترتب نہیں ہونے پاتے جو مقتضیات عقل و حکمت کے مطابق ہوں۔ یہاں آگ لگاؤ تو ہر آتش پذیر شے جل جائے گی، پانی ڈالو تو نمی کو قبول کرنے والی ہر شے بھیکٹ

جائے گی، مگر نیکی کرو تو اس کا پھل نیکی کی صورت میں ظاہر نہ ہوگا جو اس کا حقیقی عقلی نتیجہ ہے، بلکہ اس صورت میں ظاہر ہوگا۔ جو مادی قوانین کے تحت ظاہر ہو سکتا ہے خواہ وہ نیکی کے بالکل برعکس بدی ہی کی صورت کیوں نہ ہو۔ اس نقص کو دیکھ کر عقل تقاضا کرتی ہے کہ اس نظام کے بعد کوئی اور ترقی یافتہ نظام ایسا قائم ہو جس میں مادی قوانین کے بجائے عقلی قوانین جاری ہوں، اور افعال کے وہ حقیقی نتائج ظاہر ہوں جو اس نظام میں مادی قوانین کے غالب ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہو سکتے۔

نظامِ عالم کا خاتمہ

ان مقدمات کو سمجھ لینے کے بعد اب دیکھئے کہ قرآن حکیم نے قیامت اور نشاۃ آخرت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں آپ کے سوال کا کیا جواب ملتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
إِلَّا بِالْحَقِّ وَأَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (الاحقاف-۱)

”ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان جو چیزیں ہیں ان سب کو مقضائے حکمت کے مطابق اور ایک مدت مقررہ تک کے لئے پیدا کیا ہے۔“

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى۔ (الرعد-۱)

”اس نے چاند سورج کو اپنے قانون کا پابند کر دیا۔ یہ سب

ایک مدت مقررہ تک کے لئے چل رہے ہیں۔“

پھر وہ قیامت کی کیفیت سے اس طرح بیان کرتا ہے :-

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ

وَإِذَا الْبُحَارُ فَجَّتْ - وَإِذَا الْغُبُورُ بُعْثِرَتْ - (الانفطار)
 ”جب آسمان پھٹ جائے گا اور کواکب منتشر ہو جائیں

گے اور سمندر پھوٹ نکلیں گے اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی۔“

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ
 وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ - (التکویر)

”اور جب آفتاب کو لپیٹ دیا جائے گا اور تارے درہم

برہم ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے۔“

فَإِذَا النُّجُومُ طُفِسَتْ وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ وَ
 إِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ - (المرسلۃ)

”پھر جب تارے ماند پڑ جائیں گے اور جب آسمان شق کر

دیا جائے گا اور جب پہاڑ اڑائے جائیں گے۔“

فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ
 الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ - (القیمہ)

”جب آنکھیں تھمرا جائیں گی اور چاند گہنا جائے گا اور چاند

سورج ملا دیئے جائیں گے۔“

وَحُيِّلَتْ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً
 وَاحِدَةً - (الحاقہ)

”زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ٹکرا دیا جائے گا اور ایک

ہی ٹکریں وہ پاش پاش ہو جائیں گے۔“

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ
 وَالسَّمَوَاتُ وَبَدِّلُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ -

(الہایم - ۷)

”جس روز زمین بدل کر دوسری طرح کی زمین کر دی جائے

گی اور اسی طرح آسمان بھی، اور سب کے سب خدائے واحد
 قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔“

یہ سب اشارات ہیں اس طرف کہ اس نظامِ عالم کی ایک خاص
 عمر مقرر ہے۔ یہ کوئی دائمی نظام نہیں ہے۔ جب اس کی عمر پوری ہو
 جائے گی تو یہ نظام درہم برہم کر دیا جائے گا۔ سورج، زمین، چاند
 اور دوسرے سیارے جو اس نظام کے ارکان ہیں، اور جن کی گردشوں
 سے اس نظام کا قیام ہے، منتشر ہو جائیں گے، ایک دوسرے سے
 ٹکرائیں گے، اور یہ عارضی عمارت توڑ ڈالی جائے گی۔ مگر اس کے معنی
 یہ نہیں ہیں کہ عالم وجود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ خلق و ابداع کا سلسلہ
 بند کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مدعا یہ ہے کہ وجود کا یہ خاص طور جو
 اس نظام میں نظر آ رہا ہے، بدل ڈالا جائے گا، اور عالم وجود کے
 لیے ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے گا جس کی طرف *يَوْمَ تَبْدَلُ
 الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ* میں اشارہ کیا گیا ہے۔
 حیاتِ اخروی کا نظام کیا ہوگا

وہ نظام کیسا ہوگا؟ اس کی جو کیفیت قرآن میں بیان کی گئی ہے
 اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ نظام ہی کے نقص کی تکمیل
 ہے، اسی نظام کی ارتقائی صورت ہے، اور ویسی ہی ہے جیسی عقل
 چاہتی ہے کہ ہو اس نظام میں وزن اور پیمائش اور حساب سب کچھ ہو
 گا۔ مگر مادی چیزوں کے لیے نہیں بلکہ لطیف، بسیط اور مجرد حقیقتوں
 کے لیے۔ وہاں خیر اور شر، ایمان اور کفر، اخلاق اور ملکات کا وزن
 ہوگا۔ نیتوں اور ارادوں کی پیمائش ہوگی۔ دلوں کے اعمال ناپے اور
 تولے جائیں گے۔ وہاں اُس روٹی کے وزن اور اُس پیسے کے عدد
 کا حساب نہ ہوگا جو آپ نے کسی غریب کو دیا ہے بلکہ اس نیت کا

حساب ہوگا جو اس بخشش کے لئے محرک ہوئی ہے، اس لئے کہ وہاں
کا قانون مادی نہیں، عقلی ہوگا۔

إِنَّ الشَّعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ
عِنْدَ مَسْئُولٍ۔ (بنی اسرائیل - ۴)

”آئینہ اور کان اور دل سب کی پوچھ بگچھ ہوگی۔“

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا
تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ
خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ۔

(الانبیاء - ۴)

”اور قیامت کے روز ہم ٹھیک وزن کرنے والے ترازو رکھ
دیں گے پھر کسی نفس پر کچھ ظلم نہ ہوگا اور اگر ایک رائی کے دانے
کے برابر بھی عمل ہوگا تو ہم اس کو رائی لنگے اور ہم حساب کرنے
کے لئے کافی ہیں۔“

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَن ثَقُلَتْ
مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَن
خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ
(الاعراف - ۱)

”اس روز اعمال کا تولا جانا برحق ہے۔ پھر جس کے اعمال کا
وزن بھاری ہوگا وہی فلاح پانے والا ہوگا اور جس کے اعمال کا
وزن ہلکا ہوگا وہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو خود
نقصان میں ڈالا۔“

يَوْمَئِذٍ يَصُدُّ السُّرَّاسُ أَشْتَاتًا لَّا يُرَوُّا
أَعْمَالَهُمْ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا

يَرَّةٌ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔

(الزلزال)

”اُس روز لوگ جدا جدا نکلیں گے تاکہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھے گا۔“
اس دوسرے نظام میں وہ سب چیزیں نمایاں ہو جائیں گی۔ جو اس مادی نظام میں مادی قوانین کی بندشوں کے سبب سے چھپی ہوئی ہیں۔ وہاں مخفی اور مستور حقیقتیں بے نقاب سامنے آجائیں گی اور ہر چیز کی اصلی اور حقیقی حیثیت کھل جائے گی۔

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا

عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ۔ (ق۔ ۲)

”انسان سے کہا جائے گا کہ تو اس چیز سے غفلت میں تھا،

اب ہم نے تیری آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور اب تیری نگاہ

بہت تیز ہے۔“

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ۔

(الحاقة۔ ۱)

”اس روز تم پیش کیے جاؤ گے۔ تمہارا کوئی راز مخفی نہ

رہے گا۔“

وہاں افعال کے وہ حقیقی نتائج مترتب ہوں جو عقل و حکمت اور عدل و انصاف کے مطابق ہیں۔ موجودہ نظام کے مادی قوانین اور مادی اسباب و وسائل، جن کے اثر سے افعال کے حقیقی اور عقلی نتائج مترتب نہیں ہو سکتے، وہاں نافذ نہیں ہوں گے، اس لیے وہ تمام چیزیں جو یہاں عدل و انصاف میں مانع ہوتی ہیں،

اور صحیح نتائج مترتب نہیں ہونے دیتیں، وہاں بالکل بے اثر ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر یہاں دولت، مادی وسائل کی کثرت، دوستوں اور حامیوں کی طاقت، سعی، سفارش، خاندانی اثرات، خود اپنی چالاکی و ہوشیاری، اور ایسی ہی دوسری چیزیں انسان کو اس کے بہت سے افعال کے نتائج سے بچا لیتی ہیں۔ مگر وہاں ان اسباب کی تاثیریں بے باطل ہو جائیں گی اور ہر فعل کا وہی نتیجہ برآمد ہوگا جو عدل اور حق کی بنا پر برآمد ہوتا چاہیئے۔

هٰنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا اَسْلَفَتْ۔

(یونس-۳)

”وہاں ہر نفس اپنے اُن اعمال کو خود جپانچ لے گا جو وہ

پہلے کر چکا ہے۔“

وَوَقَّيْتُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

(آل عمران-۳)

”ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔“

اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔“

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ

مَحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ۔ (آل عمران-۳)

”وہ دن جب کہ ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے اور

اس بُرائی کو جو وہ کر چکا ہے حاضر پائے گا۔“

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ

شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا

عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ۔ (البقرہ-۴)

”ڈرو اس دن سے جب کہ ایک نفس دوسرے نفس کے کچھ کام

نہ آئے گا، اور نہ اس کے حق میں کوئی سفارش قبول کی جائے گی، اور نہ اس سے کوئی معاوضہ لیا جائے گا، اور نہ انکی کوئی مدد کی جاسکے گی۔“

فَإِذَا نَفَخَ فِي الصُّورِ فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ
يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَاءَلُونَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ
مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ۔
(المؤمنون - ۶)

”پھر جب صور پھونک دیا گیا تو اس روز ان میں کوئی نسی تعلق باقی نہ رہے گا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے جن کے اعمال کا پلہ بھاری ہوگا وہی لوگ ظالم پائیں گے اور جن کے اعمال ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے خود اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا۔“

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى
اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ۔ (الشعراء - ۵)

”اس دن جب کہ نہ مال کچھ نفع دے گا اور نہ اولاد۔ نجات صرف اس کی ہوگی جو خدا کے پاس قلب سلیم کے ساتھ حاضر ہوگا۔“

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فِرَادَةً كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ
مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ
وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ
أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءَ۔ لَقَدْ ثَقُلَتْ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ
عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ۔ (الانعام - ۱۱)

”تم ہمارے پاس لکھے آئے ہو جیسا ہم نے تم کو پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا۔ ہم نے تم کو جو کچھ ساز و سامان دیا تھا اس سب کو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو اور اب ہم تمہارے ان سفارشیوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم اپنی پرورش اور رزق بخشی میں خدا کا شریک سمجھتے تھے۔ تمہارے درمیان سب رابطے ٹوٹ چکے ہیں اور باطل ہو چکے ہیں۔“

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَمْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ۔ (الممتحنہ-۱)

”قیامت کے دن تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولاد تمہارے لئے کچھ بھی نافع نہ ہوگی۔ اللہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اس کو وہ دیکھتا ہے۔“

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ (عبس)

”وہ دن جب کہ آدمی اپنے بھائی اور ماں باپ اور بیوی اور بچوں سے بھاگے گا اس روز ہر شخص اپنے اپنے حال میں مبتلا ہوگا۔“

موجودہ نظام میں یہ نقص ہے کہ یہاں قدرت کے انعامات کی تقسیم انسان کے عمل اور اس کی خوبی پر منحصر نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسے اسباب پر مبنی ہے جن میں ذاتی اعمال اور نفسی صلاحیتیں محض ایک سبب کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے قوی تر اسباب ان کے تاثر کو ضعیف بلکہ بسا اوقات بالکل زائل کر دیتے ہیں۔ اس وجہ

سے انعامات کی تقسیم میں استحقاق ذاتی کو دخل نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو بہت کم۔ یہاں ایک شخص تمام عمر ظلم اور فسق کرنے کے باوجود خوشحالی اور دنیوی برکات سے متمتع ہو سکتا ہے، اور ایک شخص زندگی بھر ایمانداری اور پرہیزگاری کے ساتھ بسر کرنے کے باوجود خستہ حال اور دنیوی مصائب سے پرانندہ حال رہ سکتا ہے یہ نقص تکمیل کا محتاج ہے۔ اور حکمت کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ نظام ترقی کر کے ایک ایسے نظام میں تبدیل ہو جائے جس میں عدل کے ساتھ جزا و سزا کی تقسیم ہو، اور ہر شخص کو وہی ملے جس کا وہ اپنے ذاتی حسن و قبح کی بنا پر مستحق ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ دارِ آخرت کا نظام ایسا ہی ہوگا۔

أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ
كَالْفُجَّارِ۔ (ص-۳)

”کیا ہم ایمان لانے والوں اور نیک کام کرنے والوں کو
انہی جیسا بنا دیں گے جو زمین میں فساد کرتے ہیں؟ کیا ہم متقیوں
اور فاجروں کو یکساں کر دیں گے؟

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا الشَّيْءَاتِ أَنْ
نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
سَوَاءً مَعْيَاهُمْ وَمَعَانِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ۔
(الباقیہ-۲)

”کیا بدکاریاں کرنے والے یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو
ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے برابر کر دیں
گے اور ان کی زندگی و موت یکساں ہوگی؟ یہ کیسی بُری بات

ہے جس کا وہ حکم لگاتے ہیں۔“

وَلِكُلِّ دَرَجَاتٍ مِّمَّا عَمِلُوا۔ (الانعام - ۱۶)

”ہر ایک کے لئے ویسے ہی درجات ہوں گے جیسے انہوں

نے عمل کیے۔“

وَأَنزَلْنَا لِقَتِ الْجَنَّةِ الْمُتَّقِينَ وَبَرَرَاتِ الْجَحِيمِ

لِلْغَوِيْنَ۔ (الشعراء - ۵)

”جنت پر ہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ

گراہوں کے سامنے کر دی جائے گی۔“

یہ ہے اس دوسرے جہان کا نقشہ جس کو اس جہان کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب اور تمام انبیاء علیہم السلام کا مذہب تجویز کرتا ہے۔ جو لوگ اس جہان اور اس کے سارے کارخانے کو ایک کھیل، ایک گھروندا، ایک بے مقصد و بے حاصل ہنگامہ، اور ایک ایسا مہل گورکھ دھندا سمجھتے ہیں جو اہمال سے شروع ہوا اور اہمال ہی میں ختم ہو جائے گا، ان کو تو اس تجویز اور اس کے دلائل و شواہد میں کوئی بات ماننے کے قابل نظر نہ آئے گی۔ مگر جو شخص نظام عالم کو خدا کا آفریدہ سمجھتا ہے اور خدا کو حکیم مانتا ہے وہ ان دلائل پر غور کرنے کے بعد یقیناً یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ موجودہ نظام عالم کے بعد اس طور اور اس کیفیت کے ایک نظام کا ہونا ضروری ہے اور جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ممکن ہے، تو اس ممکن کی ضرورت کا ثابت ہو جانا اس بات پر ایمان لانے کے لئے بالکل کافی ہے کہ خدائے حکیم و دانا اس ممکن ضروری الوجود کو ضرور وجود بخشتے گا۔

اس بحث سے واضح ہو گیا کہ اسلام نے جس حیاتِ اخروی پر

ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے وہ بعید از عقل نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، بلکہ عین مقتضائے عقل و حکمت ہے، اور علم و عقل کی کسی ترقی سے اس ایمان میں رخنہ نہیں پڑ سکتا، بشرطیکہ وہ ترقی حقیقی ہو نہ کہ سطحی اور نمائشی ہے۔
اعتقادِ یومِ آخر کی ضرورت

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ اس دُنیوی زندگی کے بعد ایک اُخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن اور اغلب اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے، اور عقل (بشرطیکہ صحیح و سلیم ہو) اور علم (بشرطیکہ حقیقی ہو) ہم کو اُخروی زندگی کے اس تصور پر جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے روکتے نہیں بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اُخروی زندگی کے اس تصور پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کو ایمانیات میں کیوں داخل کیا گیا ہے؟ اس پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ مسلمان ہونے کے لئے اس کو ماننا لازم ہو اور کوئی شخص اس کو تسلیم کئے بغیر مسلمان نہ ہو سکتا ہو؟ اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس کا انکار کرنے کے بعد خدا اور رسول اور کتاب پر ایمان لانا بھی نافع نہ ہو، حتیٰ کہ زندگی بھر کے نیک اعمال بھی غارت ہو جائیں؟ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اُخروی زندگی کا نظریہ بھی ویسا ہی ایک مابعد الطبیعی نظریہ ہے جیسے مابعد الطبیعات کے دوسرے نظریات ہیں۔ ہم نے مانا کہ یہ

یہ آخرت کے دلائل کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، لفظ ”آخرت“۔ نیز مضمون ”زندگی بعد موت“ جو اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ درج ہے۔

نظریہ دلیل و حجت سے خوب مستحکم کر دیا گیا ہے، اور اس کو تسلیم کرنے کے لئے کافی وجوہ موجود ہیں۔ لیکن مابعد الطبیعات کے کسی مسئلہ کا دلیل سے ثابت ہو جانا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہو جائے اور اسی پر کفر و اسلام کا مدار ٹھہرے۔ حیاتِ اُخروی کی طرح مابعد الطبیعات کے اور بھی بہت سے نظریات ایسے ہیں جن کی تائید میں قوی دلائل موجود ہیں۔ پھر ان سب کو بھی اسی طرح داخلِ ایمان کیوں نہ کر لیا گیا؟

اگر حیاتِ اُخروی کے اعتقاد کی حیثیت محض ایک مابعد الطبیعی مسئلہ کی ہوتی تو یہ اعتراض یقیناً قوی ہوتا۔ اس صورت میں اس مسئلہ کو ایمانیات میں داخل کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، کیوں کہ کسی سے خالص مابعد الطبیعی مسئلہ کا اس حیثیت سے کہ وہ مابعد الطبیعی مسئلہ ہے، ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم اس سے خالی الذہن ہوں، یا اس کو ماننے سے انکار بھی کر دیں تو ہمارے اخلاق اور اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن حیاتِ اُخروی کے مسئلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے، اس کو ماننے سے دُنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطہ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے، اور اپنی زندگی کے تمام معاملات پر سمجھتے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لئے ذمہ دار ہے، آئندہ زندگی میں اس کو اپنے تمام اعمال کے جواب دہی کرنی ہے، اور مستقبل کی سعادت و شقاوت اُسکے

حال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔ بخلاف اس کے اس اعتقاد کو تسلیم نہ
 کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر مسئول
 ہستی سمجھے اور اپنی دنیوی زندگی کا سارا پروگرام اس خیال کے
 تحت مرتب کرے کہ وہ اس زندگی کے اعمال کے لئے کسی دوسری
 زندگی میں جوابدہ نہیں ہے، اور آئندہ کوئی اچھایا بُرا نتیجہ اس زندگی سے
 کے اعمال و افعال پر مترتب ہونے والا نہیں ہے۔ اس عقیدہ
 سے خالی الذہن ہونے یا اس کو نہ ماننے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ انسان
 کی نظر اپنے اعمال کے صرف اُن نتائج پر ہوگی جو اس دنیوی زندگی
 میں مترتب ہوتے ہیں، اور انہی نتائج کے لحاظ سے وہ رائے
 قائم کرے گا کہ کون سا فعل اس کے لئے مفید ہے اور کون سا
 مضر۔ وہ زہر کھانے اور آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ضرور احتراز کریگا
 کیوں کہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ان دونوں حرکتوں کے بُرے نتائج
 اپنی اسی زندگی میں بھگتے گا۔ لیکن ظلم، بے انصافی، جھوٹ
 غیبت، خیانت، زنا اور ایسے ہی دوسرے افعال کے پورے
 نتائج چونکہ اسی دنیوی زندگی میں نہیں ہوتے، اس لئے وہ ان سے صرف
 اسی حد تک اجتناب کریگا جس حد تک ان کا کوئی بُرا نتیجہ اس زندگی میں مترتب
 ہونے کا اندیشہ ہو۔ اور جہاں کوئی بُرا نتیجہ مترتب ہوتا نظر نہ آئے
 یا برعکس اس کے ان سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی اُمید ہو، تو
 وہ ان افعال کے ارتکاب میں کوئی تاثر نہ کرے گا۔ غرض یہ کہ اس
 تصور کے ماتحت اس کی نگاہ میں کسی اخلاقی فعل کی کوئی متعین اخلاقی
 قدر نہ ہوگی۔ بلکہ ہر ایسے فعل کی اچھائی اور بُرائی اُس نتیجہ کی اچھائی
 اور بُرائی پر منحصر ہوگی جو اس پر اس دنیا میں مترتب ہوتا ہو۔ بخلاف
 اس کے جو شخص یوم آخر کا معتقد ہوگا اس کی نظر اپنے اخلاقی افعال

کے صرف اپنی نتائج پر نہ ہوگی جو اس زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، بلکہ وہ اُن آخری نتائج پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں، اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کو جس طرح زہر کے مہلک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا اسی طرح خیانت اور جھوٹ کے مہلک اور موذی ہونے کا بھی یقین ہوگا۔ وہ جس طرح روٹی اور پانی کو مفید سمجھے گا اسی طرح عدل و امانت اور عفت کو بھی مفید سمجھے گا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو، بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اُس کے پاس اخلاقی اعمال کی متعین اخلاقی قدریں ہوں گی، اور ان قدروں میں دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔ اس کے نظام اخلاق میں صداقت، انصاف، اور وفائے عہد بہر حال صواب اور حسن ہی ہوں گے، خواہ اس دنیا میں ان سے سراسر نقصان ہی نقصان ہو اور قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور جھوٹ، ظلم اور بد عہدی بہر حال گناہ اور بدی ہی ہوں گے خواہ ان سے دنیا میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہو اور ذرہ برابر کوئی نقصان نہ ہو۔

پس حیاتِ اخروی کے اعتقاد سے خالی الذہن ہونے یا اس کا انکار کر دینے کے معنی اسی قدر نہیں ہیں کہ انسان ایک مابعد الطبیعی نظریہ سے خالی الذہن رہا یا اس نے اس نظریہ کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذمہ دارانہ اور مسئولانہ حیثیت سے غافل ہو گیا، اپنے آپ کو مطلق العنان اور جوابدہی سے بری الذمہ سمجھ بیٹھا، دنیا اور اس کی ظاہری زندگی اور اس کے غیر مکمل بلکہ

بسا اوقات دھوکہ دینے والے نتائج سے مطمئن ہو گیا، اور اس نے آخری منافع اور آخری نقصانات سے غافل ہو کر محض ابتدائی اور عارضی اور ناقابل اعتبار منفعتوں اور مضرتوں کا اعتبار کر لیا اور انہی کے لحاظ سے اپنے افعال کی ایسی اخلاقی قدریں متعین کیں جو بدلنے والی اور دھوکہ دینے والی ہیں۔ وہ ایک صحیح اور پائیدار اخلاقی ضابطہ سے محروم ہو گیا جو صرف ذمہ داری کے احساس اور آخری نتائج کے ملاحظہ اور متعین اخلاقی قدروں کے اعتبار ہی سے منضبط ہو سکتا ہے، اور اسی طرح اس نے اپنی پوری زندگی دنیا کے ناقص سطحی مظاہر سے دھوکہ کھا کر ایک ایسے ناپائیدار اور غلط اخلاقی ضابطہ کے تحت بسر کی جس میں حقیقی مضرت منفعت بن گئی، اور حقیقی منفعت مضرت قرار پائی، حقیقی حسن قبح بن گیا اور حقیقی قبح حسن قرار پایا، حقیقی گناہ صواب بن گیا، اور حقیقی صواب گناہ قرار پایا۔

یوم آخر پر ایمان نہ لانے کے یہی نتائج ہیں جن کو قرآن مجید میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں آیات قرآنی کا متبع کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ تمام خرابیاں ایک ایک کر کے گنائی گئی ہیں جو یوم آخر کو نہ مانتے سے انسان کے اخلاق اور اعمال میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۱۔ انسان اپنے آپ کو مہمل، مطلق العنان، غیر ذمہ دار سمجھتا ہے، اپنی زندگی کو بحیثیت مجموعی بے نتیجہ خیال کرتا ہے، اور یہ سمجھ کر کام کرتا ہے کہ کوئی اس کے کام کا نگران اور اس سے حساب لینے والا نہیں ہے۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَتَّكُم

إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ۔ (المؤمنون - ۴)

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا

ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہ لائے جاؤ گے؟

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى۔

(القيصمہ - ۲)

”کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے

گا۔“

أَيَحْسَبُ أَنْ لَنْ يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ يَقُولُ

أَهْلَكَتُمْ مَالًا لُبَدًا أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ

أَحَدٌ۔ (البلد)

”کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا؟

وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے

کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟

۲۔ ایسے آدمی کی نظر دنیا کے صرف ظاہری پہلو پر ہوتی ہے

ابتدائی اور سطحی نتائج کو وہ آخری حقیقی نتائج

سمجھتا ہے، اور ان سے دھوکہ کھا کر غلط رائے قائم کر لیتا۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ

عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ۔ (الروم - ۱)

”وہ دنیوی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے اور آخرت

سے تو وہ غافل ہی ہیں۔“

إِنَّ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِأَ

الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنَّنُوا بِهَا۔ (يونس - ۱)

”جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور حیاتِ دنیا

سے راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں۔“

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ

(القصص - ۱)

”ہرگز نہیں تم تو فوری حاصل ہونے والے نتائج کو پسند

کرتے ہو اور آخرت کے نتائج کو چھوڑ دیتے ہو۔“

بَلْ تُوْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ

وَابْقٰى۔ (الاعلىٰ)

”تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر ہے

اور زیادہ پائیدار ہے۔“

وَعَزَّزْتَهُمُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (الاعراف - ۶)

”ان کو حیات دنیا نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔“

۳۔ اس ظاہر یعنی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نگاہ میں اشیاء

کی اخلاقی قدروں کا معیار بالکل اُلٹا ہو جاتا ہے۔ جو چیزیں حقیقت

میں اپنے آخری نتائج کے لحاظ سے مضر ہوتی ہیں، ان کو وہ

فوری فوائد پر نظر رکھنے کی وجہ سے مفید سمجھتا ہے، اور جو اعمال

آخری نتائج کے لحاظ سے غلط ہیں ان کو وہ ابتدائی نتائج کا لحاظ

کر کے خیر و صلاح سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی دنیوی

کوششیں صحیح راہوں سے بھٹک جاتی ہیں اور آخر کار ضائع ہو

جاتی ہیں۔

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

يَلْبِثْ لَنَا مِثْلَ مَا اَوْتٰى قَارُوْنَ اِنَّهُمْ لَدَاؤُ

حَظٍّ عَظِيْمٍ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰوْتُوْا الْعِلْمَ وَيُلٰكُمُ

ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ

صَالِحًا۔ (القصص۔ ۸)

”جو لوگ دُنیوی زندگی ہی کے فائدوں کو چاہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کاش ہم کو بھی وہی ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے، وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا انہوں نے کہا کہ تم پر افسوس! اللہ کا ثواب اس شخص کے لئے بہت اچھا ہے جو ایمان لایا اور جس نے نیک اعمال کیے۔“

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ نَزِيتًا
لَهُمْ أَعْمَالُهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُونَ۔ (النمل۔ ۱)

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لئے ہم ان کے کرتوتوں کو خوشنما بنا دیتے ہیں اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔“

أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَّالٍ
وَبَنِينَ نَفْسًا بَرَاءً لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ۔
(المومنون۔ ۴)

”کیا یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہم جو ان کو مال اور اولاد سے مدد دیتے جا رہے ہیں تو گویا ان کے لئے بھلائیوں میں سرگرم ہیں؟ مگر یہ لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔“

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ
ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ
أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِمْ فَبُطِطُ

أَعْمَالُهُمْ - (الکہف - ۱۲)

”کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹوٹے میں کون لوگ ہیں؟ وہ جن کی کوششیں حیاتِ دُنیا میں بھٹک گئیں مگر وہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔“

۴۔ ایسا شخص کبھی دینِ حق کو قبول نہیں کر سکتا۔ جب کبھی اس کے سامنے مکارمِ اخلاق اور اعمالِ صالح اور راست روی کے طریقے پیش کئے جائیں گے، وہ ان کو رد کر دے گا، اور جب ان کے خلاف عقائد اور اعمال پیش کئے جائیں گے تو وہ انہیں اختیار کر لے گا۔ کیونکہ دین کے جتنے طریقے ہیں وہ دنیوی زندگی کے بہت سے فوائد و منافع اور بہت سی لذتوں کی قربانیاں چاہتے ہیں، اور ان کا اصلُ الاصول یہ ہے کہ آخرت کے بہتر اور پائندہ تر فوائد کے لیے دُنیا کے عارضی فوائد کو قربان کر دے۔ مگر منکرِ آخرت اسی دُنیا کے فوائد کو فوائد سمجھتا ہے، اس لیے وہ نہ ایسی کسی قربانی کے لیے تیار ہو سکتا ہے، اور نہ دینداری کے اُن طریقوں کو اختیار کر سکتا ہے جو ان قربانیوں کے طالب ہیں۔ لہذا انکارِ آخرت اور دینِ حق کی پیروی دونوں ایک دوسرے کے نفیض ہیں۔ جو منکرِ آخرت ہوگا وہ کبھی دینِ حق کا پیرو نہیں ہو سکتا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا

وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَىِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَلِكَ
بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ وَ
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْآخِرَةِ حَبِطَتْ
أَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ

(الاعراف - ۷۷)

”میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین
میں حق کے بغیر متکبر کرتے ہیں۔ وہ خواہ کوئی آیت دیکھ لیں،
اس پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر راہِ راست کو دیکھیں گے تو
اسے اختیار نہ کریں گے، اور اگر غلط راستے کو دیکھیں گے تو
اس پر چل پڑیں گے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں
کو جھٹلایا اور ان سے غافل رہے۔ اور جو لوگ ہماری نشانیوں
اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلائیں گے ان کے اعمال اکارت
ہو جائیں گے۔ کیا ان کو ویسا ہی بدلہ نہ ملے گا جیسے انہوں نے
عمل کیے ہیں؟

۵۔ انکارِ آخرت سے انسان کی پوری اخلاقی اور عملی زندگی متاثر
ہوتی ہے۔ وہ متکبر اور سرکش ہو جاتا ہے۔
فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُمْ مُنْكَرَةٌ
وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ۔ (النحل - ۳)

”جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل حق
بات سے انکار کرنے لگتے ہیں اور وہ متکبر ہو جاتے ہیں۔“
وَاسْتَكْبَرُوا وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُم إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ۔

(القصاص - ۴۲)

”فرعون اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے تبخر کیا اور سمجھنے لگے کہ وہ ہمارے پاس واپس نہ لائے جائیں گے۔“

اس کے معاملات بگڑ جاتے ہیں۔
وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَكْتَالُوا عَلَى
النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۖ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوا لَهُمْ
يُخْسِرُونَ ۝ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۖ
لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (المطففين)

”تباہی ہے ان بد معاملہ لوگوں کے لیے جو دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا ناپ تول کر لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایک بڑے دن اٹھائے جانے والے ہیں؟“

وہ سنگدل، تنگ نظر، ریاکار، خود غرض، اور عبادت الہی سے روگرداں ہو جاتا ہے۔

أَمْ أَمِيتَ الَّذِي يَكْذِبُ بِالذِّينِ ۚ هَٰذَا الَّذِي
الَّذِي يَدْعُ إِلَى التَّيْمَةِ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ ۚ
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۚ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ
سَاهُونَ ۚ الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ ۚ وَمِنَعُونَ الْمَاعُونَ ۚ
(الماعون)

”کیا تو نے دیکھا کہ اس شخص کو جو روز جزا کی تکذیب کرتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں اُبھارتا۔ پھر افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں۔ جو عمل نیک کرتے بھی ہیں تو دکھانے کے

لیئے، اور پھوٹی پھوٹی عام ضرورت کی چیزیں بھی لوگوں کو دینے میں دریغ کرتے ہیں۔“

مختصر یہ کہ حق سے تجاوز کرنا اور گناہوں میں مبتلا ہو جانا انکارِ آخرت کا لازمی نتیجہ ہے۔

وَمَا يَكْذِبُ بِهَا إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ۔

(المطففين)

”یوم الجزا کی تکذیب نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو حق سے تجاوز

کر گیا اور گناہوں میں پھنس گیا۔“

یوم آخر کے اعتقاد سے خالی الذہن یا منکر ہونے کے یہ ایسے نتائج ہیں جن سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے اس تمدن کے ثمرات بھی دیکھ چکے ہیں جو ظاہر حیات دُنیا پر فریفتہ ہو کر زندگی کے محض دُنوی اور مادی مطمح نظر پر قائم ہوا ہے، اور حیاتِ اُخروی کے عقیدے سے یکسر خالی ہے، ہمارے لیے اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ انکارِ آخرت کے ساتھ خدا پرستی، دینداری اور مکارمِ اخلاق کا قیام بالکل ناممکن ہے۔

اب دیکھئے کہ اسلام جب انہی چیزوں کو قائم کرنا چاہتا ہے، جب وہ انسان کو اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی طرف دعوت دیتا ہے جن کے لیے دُنیا کی بہت سی مادی لذتوں اور منفعتوں کی قربانی ضروری ہے، جب وہ انسان کو عبادتِ الہی اور تزکیہٴ نفس کی تلقین کرتا ہے جس کا کوئی فائدہ اس دُنیا میں مترتب ہوتا نظر نہیں آتا بلکہ اس کے برعکس بہت سی تکلیفوں اور مشقتوں میں انسان کے نفس اور جسم کو مبتلا ہونا پڑتا ہے، جب وہ زندگی کے تمام معاملات اور

دنیا کے اسباب و وسائل سے متمتع ہونے میں حرام و حلال اور خبیث و طیب کا امتیاز قائم کرتا ہے، جب وہ بالاتر روحانی مقاصد کے لئے انسان سے شخصی اغراض اور شخصی محبتوں اور رغبتوں اور بسا اوقات جان و مال تک کو قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے، اور جب وہ انسان کی زندگی کو ایک ایسے اخلاقی ضابطہ کے تحت منضبط کرنا چاہتا ہے جس میں دُنیوی فائدے اور نقصان سے قطع نظر کر کے ہر شے کی ایک خاص اخلاقی قدر متعین کر دی گئی ہے، تو کیا وہ ایسے دین اور ایسی شریعت کو قائم کرنے میں عقیدہ حیاتِ اُخروی کے بغیر کامیاب ہو سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انسان اس عقیدہ سے خالی الذہن یا منکر ہوتے ہوئے ایسی تعلیم کو قبول کر لیتا؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی میں ہے، تو ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے نظامِ دینی اور ضابطہ اخلاقی کو قائم کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں حیاتِ اُخروی کے عقیدہ کو راسخ کر دیا جائے۔ پس یہی وجہ ہے جس کی بنا پر اسلام نے اس عقیدہ کو ایمانیات میں داخل کیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ ایمانِ باللہ کے بعد اور کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ اسلام نے اس عقیدہ کو کس شکل میں پیش کیا ہے اور اس سے انسان کے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

دنیا پر آخرت کو ترجیح

سب سے پہلی چیز جس کو قرآن مجید نے انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا انسان کے لئے ایک عارضی قیام ہے۔ اس کے لئے صرف یہی ایک زندگی نہیں ہے بلکہ

اس کے بعد ایک دوسری زندگی اس سے بہتر اور پائندہ تر بھی ہے جس کے فوائد یہاں کے فائدوں سے زیادہ فراواں اور جس کے نقصانات یہاں کے نقصانات سے زیادہ سخت ہیں۔ جو شخص اس دُنیا کے مظاہر سے دھوکہ کھا کر اسی کی لذتوں اور منفعتوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اور ان کو حاصل کرنے کے لئے ایسی کوششیں کرتا ہے جنکی بدولت اس دوسری زندگی کی لذتیں اور منفعتیں اسے حاصل نہیں ہو سکتیں، وہ بہت بُرا سودا کرتا ہے اور حقیقت میں اس کی یہ تجارت سراسر نقصان کی تجارت ہے۔ اسی طرح جو شخص اس دُنیا کے نقصان ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے ایسی سعی کرتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو اس دوسری زندگی کے نقصان کا مستحق بنا لیتا ہے، وہ بہت بڑی حماقت کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا یہ فعل کسی طرح مقتضائے دانش مندی نہیں ہے۔ اس مضمون کو قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ تمام آیات کا استقصاء یہاں ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں :-

مَا هَذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَانَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيٰوةُ النَّصِيۡبُ (العنکبوت۔ ۷)

”یہ دُنیا کچھ نہیں ہے مگر لہو و لعب۔ اور اصلی زندگی کا

گمراہی ہے۔“

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ

اٰتَقَىٰ (النساء۔ ۱۱)

”کہو اے محمدؐ! کہ متاعِ دُنیا تھوڑی سی ہے، اور آخرت

اس کے لئے بہتر ہے جو پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔“

اَمْ رَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ

فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ۔

(التوبہ - ۶)

”کیا تم آخرت کے عوض دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے؟
دنیا کی زندگی کے سامان تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑے
ہیں۔“

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ
وَأَبْقَى۔ (الاعلیٰ)

”تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت زیادہ بہتر
اور باقی رہنے والی ہے۔“

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ
الْجُورَ كَمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ
وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ۔ (آل عمران - ۱۹)

”ہر شخص کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو اپنی اس زندگی سے
کے پورے پورے بدلے قیامت کے دن ملنے والے ہیں۔ پس
اس روز جو شخص آگ کے عذاب سے بچ گیا اور جنت میں داخل
کیا گیا وہی اصل میں کامیاب ہوا۔ یہی اس دنیا کی زندگی تو یہ
محض دھوکے کا سامان ہے۔“

وَاتَّبِعِ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أَتَرَفُوا فِيهَا وَكَانُوا
مُجْرِمِينَ۔ (ہود - ۱۰)

”جن لوگوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے۔ وہ انہی
لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم
ہوئے۔“

قُلْ إِنَّ الْخَاسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ
وَأَهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ۚ أَلَا ذَلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ
الْمُبِينُ۔ (الزمر-۲)

”اے محمد! کہہ دو کہ سخت نقصان میں وہ لوگ ہیں جنہوں
نے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو قیامت کی دین نقصان
میں ڈالا۔ یہی اصلی اور کھلا ہوا ٹوٹا ہے۔“

فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۖ فَإِنَّ
الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۖ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ
وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ۔
(النازعات-۲)

”پھر جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو جہنم
اس کا ٹھکانا ہے۔ اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے
کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا، تو جنت اس کا
ٹھکانا ہے۔“

اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ
وَنَازِلَةٌ ۖ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَ
الْأَوْلَادِ ۖ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّاءَ نَبَاتٌ
ثُمَّ يَهَيِّجُ فَتَرْدُهُ ۚ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ۚ وَ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۚ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ
وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ۔

(الحديد-۳)

”جان لو کہ حیاتِ دنیا تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے
میں کھیل اور کود اور ریت اور آپس کا تفاخر اور مال و اولاد میں

ایک دوسرے سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی مثال بارش کی سی ہے کہ اس سے کھیتی لہلہلاتی ہے اور کسان اس کو دیکھ کر خوشیاں مناتے ہیں۔ پھر وہ پک کر خشک ہو جاتی ہے اور تو دیکھتا ہے کہ وہ زرو پڑ گئی اور آخر کار روند ڈالی گئی۔ اس کے بعد آخرت کی زندگی ہے جس میں کسی کے لئے سخت عذاب ہے اور کسی کے لئے اللہ کے طرف سے مغفرت اور خوشنودی۔ پس دنیا کی زندگی محض ایک دھوکے کا سامان ہے۔“

زَيْنَ النَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ
وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ
الْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ
ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَ حُسْنِ
الْمَالِ - قُلْ أَوْفَيْتُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذِكْمِ الَّذِينَ
اتَّقَوْا عِنْدَ مَا بِهِمْ جَدْتُ تَجْرِي مِّنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَنَا وَاجِبٌ مِّمَّنْ قَطَعُوا
مِنَ اللَّهِ - (آل عمران - ۲)

”لوگوں کے لئے عورتوں اور بچوں اور سونے چاندی کے ڈھیروں اور نشان لگے ہوئے گھوڑوں اور جانوروں اور کھیتوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے۔ یہ دنیوی زندگی کی متاع ہے۔ مگر اللہ کے پاس اس سے اچھا ٹھکانا ہے کہو اے محمد! کیا میں تمہیں اس سے بہتر متاع کی خبر دوں؟ جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ ازواج ملیں گی اور وہ اللہ کی خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔“

دُنیا پر آخرت کی ترجیح اور آخرت کی دائمی کامیابی کے لئے دُنیا کے عارضی منافع کو قربان کرنے، اور آخرت کی ابدی نامرادی سے بچنے کے لئے دُنیا کے چند روزہ نقصانات کو برداشت کرنے کی یہ تعلیم نہایت پُر زور اور مؤثر انداز سے اسلام میں دی گئی ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو شخص قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے وہ کسی زور اور زبردستی سے نہیں بلکہ اپنی دلی رغبت سے ہر وہ کام کرے جسکو کتاب اور رسول نے آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بتایا ہے، اور ہر اُس چیز سے اجتناب کرے جس کو ان دونوں نے آخرت کے نقصانات کا سبب قرار دیا ہے، خواہ دُنیا میں وہ اس کے لئے کتنا ہی مفید یا مضر ہو۔

نامہ اعمال اور عدالت

دوسری بات جس کو قرآن مجید نے انسان کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی ہے، یہ ہے کہ انسان اپنی دُنوی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے، خواہ کتنا ہی چھپا کر کرے، اُس کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ محفوظ رہتا ہے۔ قیامت کے روز یہی ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش ہو گا۔ ہر ہر ذرہ جس کو انسان کے افعال سے کسی نوع کا تعلق رہا ہے، اس کے ان افعال پر گواہی دے گا۔ حتیٰ کہ خود اس کے اپنے اعضاء بھی اس کے خلاف گواہوں کے کھڑے میں کھڑے ہوں گے۔ پھر اسکے نامہ اعمال کا نہایت صحیح وزن کیا جائے گا۔ میزانِ عدل کے ایک پلٹے میں اس کے نیک اعمال ہوں گے اور دوسرے میں بُرے اعمال۔ اگر نیکی کا پلڑا جھک گیا تو آخرت کی کامیابیاں اس کا خیر مقدم کریں گی اور جنت اس کے لئے جلائے قیام ہوگی۔ اور بدی کا پلڑا بھاری رہا تو خسرانِ مبین اس کا نتیجہ ہوگا اور وہ بدترین مقام اس کے

لئے تجویز کیا جائے گا جس کا نام دوزخ ہے۔ اُس عدالت میں ہر شخص
تہا اپنے نامہ اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا اور دنیوی اسباب میں سے
کوئی چیز اس کے کام نہ آئے گی۔ نہ نسبی اعزاز، نہ سعی و سفارش، نہ
مال و دولت، اور نہ قوت و طاقت۔

اس مضمون کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اور بڑے مؤثر انداز میں
بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند آیات یہاں پیش کی جاتی ہیں:-
نامہ اعمال کی کیفیت:

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسْرَأَ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ
بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَاهِبٌ بِالنَّهَارِ
لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهَا وَمِنْ خَلْفِهَا
يَحْفَظُونَهَا مِنْ أَمْرِ اللَّهِ - (الرعد - ۲)

”تم میں سے جو شخص چپا کر بات کرتا ہے اور جو زور سے

بولتا ہے اور جو شخص رات کی تاریکی میں چپا ہوا ہے اور جو دن کی
روشنی میں چل رہا ہے، دونوں یکساں ہیں۔ بہر حال ہر ایک کے
آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے لگے ہوئے ہیں اور وہ خدا
کے حکم سے اس کی ہر بات ثبت کر رہے ہیں۔“

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ
مِمَّا فِيهَا وَيَقُولُونَ يُوَيْلَتَنَا مَا لِ هَذَا الْكِتَابِ
لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَ
وَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا - (الکہف - ۶)

”نامہ اعمال پیش ہوگا تو اس میں جو کچھ لکھا ہوگا، تم دیکھو
گے کہ مجرم اس سے ڈریں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس!
اس کتاب کا کیا حال ہے کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات نہیں چھوڑتی۔“

سب اس میں موجود ہے۔ جو کچھ انہوں نے عمل کیے تھے۔ ان سب کو وہ حاضر پائیں گے۔“

اعضاء کی گواہی اور انسان کا اعتراف:

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ
وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (النور-۳)

”وہ دن جب کہ ان پر خود ان کی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انہوں نے کیے تھے۔“
حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاؤُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ
وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ
وَقَالُوا لِمَ لَاحِدُوهُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا
أَنطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ..... وَمَا
كُنْتُمْ تَسْتَرُونَ أَن تَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ
وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ
أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ۔

(الحج السجدہ-۳)

”یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے
کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان اعمال کی گواہی دیں
گی جو وہ کرتے تھے۔ وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے
ہمارے خلاف کیوں گواہی دی ہے وہ جواب دیں گے کہ ہم کو اس
خدا نے گویائی بخشی ہے جس نے ہر شے کو گویا کر دیا ہے....
..... تم چھپا کر کام کرتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ تمہارے اعمال
پر خود تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں گواہی دیں گی۔ بلکہ تم
سمجھتے تھے کہ تمہارے بہت سے اعمال سے اللہ بھی ناواقف

”ہے“

وَشَهِدُوا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَنْتُمْ كَاٰنُوا كٰفِرِيْنَ۔

(الانعام-۱۴)

”وہ خود اپنے خلاف شہادت دیں گے کہ وہ ناشکر گزار

بندے تھے۔“

اس نامہ اعمال اور ان شاہدوں کے ساتھ انسان خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ پھر اس پیشی کی کیا کیفیت ہوگی ؟ وہ اکیلا بے یار و مددگار کھڑا ہوگا۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فِرَادٰی كَمَا خَلَقْنَاكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَآءَ ظُهُورِكُمْ۔

(الانعام-۱۱)

”اب تم ہمارے پاس ویسے ہی یکہ و تنہا آئے ہو جیسا ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم ان سب چیزوں کو چھوڑ آئے ہو جو ہم نے تم کو دی تھیں۔“

ہر شخص آپ اپنا حساب پیش کرے گا:

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلَزَمْنٰهُ طَائِرَةً فِیْ عُنُقِهٖا وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِيَمَةِ كِتٰبًا يَلْقٰهُ مِنْ شُوْرٰٓءٍ اَقْرٰٓءَ كِتٰبٰتِكَ كَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلٰیكَ حَسِیْبًا۔

(بنی اسرائیل-۲)

”ہر شخص کی بُرائی اور بھلائی کا نوشتہ ہم نے اس کے

گلے میں لٹکا رکھا ہے اور ہم اس کے لئے قیامت کے روز ایک

کتاب نکالیں گے جس کو وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیگا۔ اس

سے کہا جائے گا کہ اپنا نامہ اعمال پڑھ، آج خود تو ہی اپنا

حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔“

خاندانی اثرات کسی کام نہ آئیں گے:

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ۔ (المتحنہ - ۱)

”قیامت کے روز نہ تمہارے نسبی رشتے کسی کام آئیں گے

اور نہ اولاد۔“

سفارش سے کام نہ چلے گا:

مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ۔

(المومن - ۲)

”ظالموں کے لئے نہ کوئی دوست ہوگا نہ کسی سفارشی کے

بات مانی جائے گی۔“

رشوت نہ چلے گی:

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ۔ (الشعراء - ۵)

”وہ دن جب کہ نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔“

اعمال تو بے جاییں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا:

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ
مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ۔

(الانبیاء - ۴)

”ہم قیامت کے روز ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں

گے۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اور اگر ایک رائی کے دانہ بھر

بھی عمل ہوگا تو ہم اس کو بے آئیں گے اور ہم حساب کرنے

کے لئے کافی ہیں۔“

جزا اور سزا جو کچھ بھی ہوگا، عمل کے مطابق ہوگی۔

الْيَوْمَ تَجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (الباقیہ - ۲)

”ہر ایک کیلئے ویسے ہی درجے ہونگے جیسے انہوں نے عمل کیے۔“

وَلِكُلِّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوا۔ (الانعام - ۱۶)

”آج تم کو ویسا ہی بدلہ دیا جائیگا جیسے تم عمل کرتے تھے۔“

یہ وہ پولیس اور عدالت ہے جس کا خوف انسان کے نفس میں بٹھا دیا گیا ہے یہ دنیا کی پولیس نہیں ہے جس کی نگاہ سے انسان بچ سکتا ہے، نہ یہ دنیا کی عدالت ہے جس کی گرفت سے انسان شہادتوں کے فراہم نہ ہونے یا جھوٹی شہادتیں فراہم ہو جانے یا ناجائز اثرات پڑ جانے کی بدولت رہائی پا سکتا ہے بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے، اور یہ ایسی عدالت ہے جس کے گواہوں کی نظر سے وہ کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا، جس کے پاس اس کے ہر خیال اور ہر عمل کی روداد موجود ہے، اور جس کے فیصلے اتنے منصفانہ ہیں کہ کوئی گناہ سزا سے اور کوئی صواب جزا سے چھوٹ ہی نہیں سکتا۔

اعتقادِ یومِ آخر کا فائدہ

اس طرح اسلام نے یومِ آخر کے عقیدہ کو اپنے ضابطہ اخلاقی اور نظام شرعی کے لئے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لئے عقلی ترغیب بھی موجود ہے، اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنے بقاء و استحکام کے لئے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے، بلکہ وہ ایمانِ بالیومِ الآخر کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک

ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ اُن نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے، اور اُن گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اُس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھیرایا ہے۔

قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ اس عقیدہ کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ :

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلْقَوْنَ۔

(البقرہ - ۲۸)

”اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا

ہے۔“

راہِ خدا میں سرفروشی کے لئے اُبھارا جاتا ہے تو ساتھ یہ بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر تم مارے جاؤ گے تو درحقیقت مرنے جاؤ گے بلکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤ گے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہے :

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ

بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ۔ (البقرہ - ۱۹)

”اور نہ کہو ان لوگوں کو مُردے جو اللہ کی راہ میں مارے

جاتے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور لیکن تم نہیں سمجھتے۔“

مصائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لئے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے۔ اس حقیقت کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے :

أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ

وَمَا خَصَّنَا (البقرہ-۱۹)

”وہ لوگ اوپر ان کے درود ہیں پروردگار ان کی طرف سے

اور رحمت۔“

بے خوفی اور بہادری کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ:

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلتَقُوا لِلَّهِ كَمَ
مِّنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَةً كَثِيرَةً بِأُذُنِ
اللَّهِ (البقرہ-۳۳)

”جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے

انہوں نے کہا کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر

غالب آجاتی ہے۔“

سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت

یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ

نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا (التوبہ-۱۱)

”جہنم کی آگ دنیا کی گرمیوں سے زیادہ سخت ہے۔“

نیک کاموں میں مال خرچ کرنے کے لئے یہ کہہ کر ابھارا جاتا

ہے کہ

وَمَا تَنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتِ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ

لَا تَظْلَمُونَ (البقرہ-۲۷)

”جو کچھ خیرات تم کرو گے اس کا پورا اجر تم کو ملے گا اور

تمہارے ساتھ ظلم نہ ہوگا۔“

بخل سے روکنے کے لئے فرمایا جاتا ہے کہ

وَلَا يَخْسِبَنَّ الَّذِينَ يَبْغُلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ

مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ

سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ۔

(آل عمران-۱۸)

”جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مالدار کیا ہے اور پھر وہ اس میں بخل کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لئے اچھا ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں بُرا ہے۔ جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔“

سود خواری کے فائدوں سے دست بردار ہونے کے لئے یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ

وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهَا إِلَى اللَّهِ۔

(البقرہ-۳۸)

”اُس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔“

متاع دُنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوشحالی پر رشک نہ کرنے کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ

لَا يَغْرَنَكَ تَقَلُّبُ الدِّينِ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ
مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ
الْبِهَادُ۔ لَكِنَّ الدِّينَ اتَّقُوا بِهِمْ لَهُمْ جَنَّتٌ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا تَزُكَا
مَنْ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّالْبَرَاءِ۔

(آل عمران-۲۰)

”اے نبی! دُنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کو کھے چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ محض چند روزہ

زندگی کا لطف ہے، پھر سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے
 قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے
 زندگی بسر کرتے ہیں، ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے
 نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کی طرف
 سے یہ سامان ضیافت ہے ان کے لئے، اور جو کچھ اللہ کے پاس
 ہے نیک لوگوں کے لئے وہی سب سے بہتر ہے۔“

اسلامی تہذیب میں ایمان کی اہمیت

ایمانیات پر مجموعی نظر

ایمان کے پانچوں شعبوں پر تفصیل کے ساتھ کلام کیا جا چکا ہے ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسلام کا تفصیلی عقیدہ، نقدِ صحیح کے لحاظ سے اس کا عقلی مرتبہ، انسانی سیرت پر اس کے اثرات، اور تہذیب کی تاسیس و تشکیل میں اس کا حصہ آپ معلوم کر چکے ہیں۔ اب ایک مرتبہ مجموعی حیثیت سے ان سب پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ یہ ایمانیاں مل جل کر کس قسم کی تہذیب پیدا کرتے ہیں۔

اس مضمون کے ابتدائی ابواب میں بیان کیا چکا ہے کہ اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد حیاتِ دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کرۂ خاکی میں عام موجودات کی سی نہیں ہے، بلکہ وہ خداوندِ عالم کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر اتارا گیا ہے۔ اس تصور سے بطور ایک عقلی نتیجہ کے انسان کی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے، اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لئے ضروری ہو گیا کہ :-

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے،

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر اور ناہی، حاکم اور مطاع سمجھے اور

اپنے اختیار کو احکامِ خداوندی کے تابع کر دے،

ثالثاً، وہ اُن طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی

حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے،

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیاتِ دنیا کے مشکل نتائج سے دھوکہ نہ کھائے۔

وہ پانچ عقیدے جن کی تفصیل آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔

خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہ سب اس لئے ہے کہ انسان کو اس ہستی کی صحیح معرفت حاصل ہو جس کی طرف سے وہ خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا ہے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ لہٰذا کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس لئے ہے کہ انسان، کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کار فرمانہ سمجھ بیٹھے، اور کار فرمانی میں خدا کے سوا کسی کو شریک نہ قرار دے۔ اس علم صحیح کے بعد خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تمام کائنات پر، اور خود انسان کی زندگی کے غیر اختیاری شعبے پر خدا کی حکومت ہے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت تسلیم کرے، ہر معاملہ میں خدا کو واضح قانون اور اپنے آپ کو صرف متبع قانون سمجھے، اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو خدا نے مقرر کیے ہیں۔ یہی ایمان اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے جو انسان کو خدا کی فرماں روائی کے آگے بطوع و رغبت سر تسلیم خم کر دینے کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ اس سے مردِ مومن کے اندر ایک خاص نوعیت کا ضمیر پیدا ہوتا ہے اور ایک خاص قسم کی سیرت بنتی ہے جو قانون اور حدود کا

مجبوراً نہیں بلکہ رضا کارانہ اتباع کرنے کے لئے ضروری ہے۔
 رسالت اور کتاب کا عقیدہ تیسری ضرورت کو پورا کرتا ہے۔
 انہی دونوں کے ذریعہ سے انسان کو اُن قوانین اور اُن طریقوں کا تفصیلی
 علم ہوتا ہے جن کو خدا نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے۔ اور اُن
 حدود کی شناخت میسر ہوتی ہے جن سے خدا نے انسان کے اختیارات
 کو محدود فرمایا ہے۔ رسول کی تعلیم کو خدا کی تعلیم، اور اس کی پیش کی
 ہوئی کتاب کو خدا کی کتاب سمجھنا ہی ایمان بالرسالت اور ایمان
 بالکتاب ہے، اور اس ایمان ہی سے انسان میں یہ قابلیت پیدا
 ہوتی ہے کہ یقین و اذعان کے ساتھ اُن قوانین اور طریقوں اور حدود
 کی پابندی کرے جو خدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے واسطے
 سے اس کو بتائے ہیں۔

آخری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے معاد کا علم ہے۔ اس
 سے انسان کی نظر اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا کے پیچھے
 ایک دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ
 اس دنیا کی خوش حالی و بد حالی، اور منفعت و مضرت، خدا کی خوشنودی و
 ناخوشی کا معیار نہیں ہے، اور خدا کی جانب سے اعمال کی جزا و سزا
 اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آخری فیصلہ ایک دوسرے عالم
 میں ہونے والا ہے۔ وہی فیصلہ معتبر ہے اور اس فیصلے میں کامیابی
 کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا کے قانون کی صحیح پیروی اور
 اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پوری پابندی کی جائے۔ اسی
 عقیدے پر جزم و یقین کا نام ایمان بالیوم الآخر ہے اور ایمان
 باللہ کے بعد یہ دوسری زبردست قوت ہے جو انسان کو قوانین
 اسلامی کے اتباع پر ابھارتی ہے۔ تہذیب اسلامی کے لئے انسان

کو ذہنی اعتبار سے مستعد کرنے میں اس اعتقاد کا بڑا حصہ ہے۔
 اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اساسی اعتقادات انہی
 خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کرتے ہیں جو حیاتِ دنیا کے
 اُس مخصوص تصور اور خاص نصب العین نے کھینچ دیئے تھے۔ ایسی
 تہذیب کے لئے عقلاً جس اساسی عقیدہ کی ضرورت ہے وہ انہی پانچ
 امور پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ
 صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لئے اساس بن
 سکے۔ کوئی دوسرا عقیدہ اس خاص تصورِ حیات اور نصب العین کیساتھ
 مناسبت نہیں رکھتا۔

تہذیبِ اسلامی کا خاکہ

ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں ان پر نظر ڈالنے
 سے اُس تہذیب کا پورا خاکہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جسکی تاسیس
 ان کے ذریعہ سے کی گئی ہے۔ اس خاکہ کی نمایاں خصوصیات یہ
 ہیں :-

۱۔ اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے۔ اس میں
 خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے محض ایک ”معبود“ کی
 سی نہیں ہے، بلکہ دنیوی تصور کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی
 ہے۔ وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نمائندہ
 ہے، قرآن اس کی کتابِ آئین ہے، اور ہر وہ شخص جو اسکی شہنشاہی
 کو تسلیم کرے اس کے نمائندے کی اطاعت اور اس کی کتابِ
 آئین کا اتباع کرنا قبول کرے، اس سلطنت کی رعیت ہے۔ مسلمان
 ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے اپنے نمائندے اور اپنی
 کتابِ آئین کے ذریعہ سے جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں انکو بے چون و

چرا تسلیم کیا جائے خواہ اُن کی علت و مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو شخص خدا کا یہ اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی و اجتماعی ارادے سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا، اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لئے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لئے اس سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۲۔ چوں کہ اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (یعنی آخرت کے فیصلہ میں خداوندِ عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لئے تیار کرنا ہے، اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل پر موقوف ہے، اور یہ جانتا کہ آخری نتیجہ کے اعتبار سے کون سا عمل مفید ہے اور کون سا مضر انسان کے بس کا کام نہیں ہے، بلکہ وہی خدا اس کو بہتر جانتا ہے جو آخرت میں فیصلہ کرنے والا ہے، اس لئے یہ تہذیب انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے اور اپنی آزادی عمل کو شریعتِ الہی کی قیود سے مقید کرنے۔ اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جامع ہے۔ اس کو عام محدود معنوں میں ”مذہب“ کے لفظ سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات، اس کے شخصی کردار و اخلاق، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرت، اس کے تمدن، اس کی سیاست، سب پر حاوی ہے، اور ان تمام معاملات میں جو طریقے اور قوانین خدا نے مقرر کیے ہیں ان کے مجموعہ ہی کا نام ”دین اسلام“ یا ”تہذیب اسلامی“ ہے۔

۳۔ یہ تہذیب کوئی قومی یا ملکی یا نسلی تہذیب نہیں ہے، بلکہ صحیح

معنوں میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بحیثیت انسان کے خطاب کرتی ہے، اور اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو توحید، رسالت، کتاب، اور یوم آخر پر ایمان لائے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز رنگ و نسل و زبان ہر انسان داخل ہو سکتا ہے، جس کے اندر تمام رُوائے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے، اور جو تمام بنی آدم کو ایک نظم و ملت میں پیوستہ کر دینے، اور ان سب کو ایک تہذیب کا متبع بنادینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ لیکن یہ عالمگیر انسانی برادری قائم کرنے سے اس کا اصل مقصد اپنے متبعین کی مردم شماری بڑھانا نہیں ہے، بلکہ تمام انسانوں کو اس علم صحیح اور عمل صحیح کے فیض میں شریک کرنا ہے جو ان سب کے خُدا نے ان سب کی بھلائی کے لئے عطا فرمایا ہے اس لئے وہ اس برادری میں شامل ہونے کے لئے ایمان کی قید لگا کر صرف ان لوگوں کو چن لینا چاہتی ہے جو خُدا کی حکومت مطلقہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے لئے آمادہ ہوں، اور اُن حدود اور قوانین کی پابندی قبول کریں جو خُدا نے اپنے رسول اور اپنی کتاب کے ذریعہ سے مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ صرف ایسے ہی لوگ (خواہ وہ کتنے ہی کم ہوں) اس تہذیب کے نظام میں کھپ سکتے ہیں، اور انہی سے ایک صحیح اور مضبوط نظام قائم ہو سکتا ہے۔ منکرین یا منافقین یا ضعیف الایمان لوگوں کا گھس آنا اس نظام کے لئے سبب قوت نہیں بلکہ موجب ضعف ہے۔

۲۔ ہمہ گیری اور آفاقیت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست ڈسپلن اور اسکی طاقتور گرفت ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ حکم دینے سے پہلے وہ اس کا انتظام کرتے ہیں کہ اس کا حکم نافذ ہو۔ سب سے پہلے وہ انسان سے خدا کی فرماں روائی تسلیم کراتے ہیں۔ پھر اس کو یقین دلاتے ہیں کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ سے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں، اور ان کے اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی پولیس مقرر کر دیتی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کو احکام کی اطاعت پر ابھارتی ہے، خلاف ورزی پر سرزنش کرتی ہے، اور عذابِ یومِ عظیم کا خوف دلاتی رہتی ہے۔ اس طرح جب وہ اس قوتِ نافذہ کو ہر شخص کے نفس و ضمیر میں متمکن کر کے اپنے پیروؤں میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنی دلی رغبت سے قوانین کے اتباع اور حدود کی پابندی اور اخلاقِ حسنہ سے متعلق ہونے کے لئے آمادہ ہوں، تب وہ ان کے سامنے اپنے قوانین پیش کرتے ہیں، ان کو احکام دیتی ہے، ان کے لئے حدود مقرر کرتے ہیں، ان کے لئے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرتے ہیں، اور اپنے مصالح کے لئے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس سے زیادہ حکیمانہ طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس طریقہ سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو نصیب نہیں ہوا۔

۵۔ دنیوی نقطہ نظر سے یہ تہذیب ایک صحیح اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی وجود لانا چاہتی ہے۔ مگر

ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے افراد اخلاقِ فاضلہ و صفاتِ حسنہ سے متصف نہ ہوں۔ اس غرض کے لئے ضروری ہے کہ افراد کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے تاکہ وہ رقی اور منتشر افکار کی آماجگاہ نہ رہیں۔ صحیح اور پاکیزہ ذہنیت ان کے اندر راسخ کی جائے تاکہ ان میں ایک ایسی مضبوط سیرت پیدا ہو سکے جس سے اعمالِ صالح کا صدور بالطبع ہونے لگے۔ اسلام نے اپنی تہذیب میں اس قاعدہ کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ افراد کی تربیت کے لئے وہ سب سے پہلے ان میں ایمان کو راسخ کرتا ہے جو ایک اعلیٰ درجے کی مضبوط سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعہ سے وہ افراد میں صداقت، امانت، نیک نفسی، احتساب، حق پسندی، ضبطِ نفس، تنظیم، قیاضی، وسعتِ نظر، خودداری، انکسار و فروتنی، فراخ حوصلگی، بلند ہمتی، ایثار و قربانی، فرض شناسی، صبر و استقامت، شجاعت و بسالت، قناعت و استغناء، اطاعتِ امر اور اتباعِ قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اور ان کو اسے قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے۔

۴۔ اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاقِ حسنہ و ملکاتِ فاضلہ پیدا کرنے والی اور ان کی پرورش اور حفاظت کرنے والی ہیں۔ دوسری طرف انہی ایمانیات میں یہ قوت بھی ہے کہ وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لئے ابھارتے ہیں اور اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسائل کو بہترین طریقہ پر برتے اور ان تمام قوتوں کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں۔ پھر یہی ایمانیات

اس میں وہ تمام عمدہ اوصاف بھی پیدا کرتے ہیں جو دنیا میں حقیقی ترقی کے لئے ضروری ہیں۔ اُن میں انسان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے اور تنظیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ہے، اور اس کے ساتھ اُن میں یہ طاقت بھی ہے کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دیں، اور اُن راستوں سے منحرف نہ ہونے دیں جن سے ہٹ جانا تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر وہ تمام خوبیاں مع شیء رائد رکھتے ہیں جو دوسرے مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں جُدا جُدا پائی جاتی ہیں، اور اُن تمام خرابیوں سے پاک ہیں جو مختلف مذہبی اور دنیوی ایمانیات میں موجود ہیں۔

تہذیبِ اسلامی میں ایمان کی اہمیت

یہ اُس تہذیب کا ایک مجمل خاکہ ہے جس کو اسلام نے قائم کیا ہے۔ اگر ہم تمثیل کے پیرایہ میں اس کو ایک عمارت فرض کر لیں، تو یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کو مستحکم کرنے کے لئے نہایت گہری نیوکھودی گئی، پھر چھانٹ چھانٹ کر پختہ اینٹیں مہیا کی گئیں۔ اور ان کو بہترین چوڑے سے پیوستہ کر دیا گیا، پھر عمارت اس شان کے ساتھ بنائی گئی کہ بلندی میں آسمان تک اٹھتی چلی جائے اور وسعت میں آفاق پر پھیلتی جائے، مگر اس وسعت و رفعت کے باوجود اسکے ارکان میں ذرا تنزل واقع نہ ہو اور اس کی دیواریں اور اس کے ستون چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز پر بنائے گئے ہیں کہ باہر کی روشنی اور صاف ہوا کو بخوبی داخل ہونے دیتے ہیں، مگر گرد و غبار اور خس و خاشاک اور باد و باران کو داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ہوئی ہیں ایک ہی چیز

بدولت ہیں، اور وہ ایمان ہے۔ وہی اس کی بنیادیں استوار کرتا ہے۔ وہی رڈی اور ناکارہ مواد کو چھانٹ کر عمدہ مواد اخذ کرتا ہے۔ وہی مواد خام کو پکا کر پختہ اینٹیں تیار کرتا ہے۔ وہی ان اینٹوں کو پیوستہ کر کے ایک بنیانِ مرصوص بناتا ہے۔ اسی پر عمارت کی وسعت و رفعت اور استحکام کا انحصار ہے۔ وہی اس کو پھیلاتا بھی ہے، بلند بھی کرتا ہے، مضبوط بھی کرتا ہے، بیرونی مفسدات سے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے اور پاکیزہ چیزوں کو اس میں داخل ہونے کا موقع بھی دیتا ہے۔ پس ایمان اس عمارت کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا قائم رہنا کیسا، وجود میں آنا ہی محال ہے۔ اور اگر یہ ضعیف ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عمارت کی بنیادیں کمزور، اس کی اینٹیں بودی، اس کا چونا خراب، اس کے ارکان متزلزل ہیں، اس کے اجزاء میں پیوستگی نہیں، اس میں پھیلنے اور بلند ہونے کی صلاحیت نہیں، اس میں بیرونی مفسدات کو روکنے اور اپنی پاکیزگی و نظافت کو محفوظ رکھنے کی قوت نہیں۔

غرض ایمان کا عدم اسلام کا عدم ہے، ایمان کا ضعف اس کا ضعف ہے، اور ایمان کی قوت اس کی قوت۔ پھر چونکہ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں بلکہ اخلاق، تہذیب، معاشرت، تمدن، سیاست سب کچھ ہے، اس لئے ایمان کی حیثیت اس نظام میں صرف مذہبی عقیدہ ہی کی نہیں ہے، بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور انکی سیرت کا بھی انحصار ہے۔ وہی ان کے معاملات کی درستی کا بھی ذمہ دار ہے۔ وہی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے۔ وہی ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی محافظت بھی کرتا ہے۔ وہی ان کے تمدن، ان کی معاشرت، اور ان کی سیاست کا مایہ خمیر بھی ہے۔ اُس کے بغیر

اسلام نہ صرف ایک ”مذہب“ کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتا بلکہ بحیثیت ایک تہذیب و تمدن اور نظام سیاسی کے بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ ایمان ضعیف ہو تو یہ محض مذہبی عقیدہ کا ضعف نہیں ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاق خراب ہو جائیں، ان کی سیرتیں کمزور ہو جائیں، ان کے معاملات بگڑ جائیں، ان کے معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درہم برہم ہو جائے، ان کے درمیان قومیت کا رشتہ ٹوٹ جائے، اور وہ ایک آزاد اور با عزت اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان ہی پر اسلام و کفر کا مدار رکھا گیا ہے اور وہی نظام اسلامی میں داخل ہونے کی شرط اولین ہے۔ سب سے پہلے انسان کے سامنے ایمان ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے ایمان کو قبول کر لیا تو اُمتِ مسلمہ میں داخل ہو گیا، مسلمانوں کی معاشرت، تمدن، سیاست، سب میں برابر کا شریک ہو گیا اور تمام احکام، حدود اور قوانین اس سے متعلق ہو گئے، لیکن اگر اس نے ایمان کو قبول نہیں کیا تو وہ دائرۂ اسلامی میں کسی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتا، اسلام کا کوئی حکم اور کوئی قانون اس پر نافذ نہ ہوگا، اور مسلمانوں کی جماعت میں وہ کسی طرح شریک نہ ہو سکے گا، کیونکہ اس نظام میں اس کی کھپت قطعاً محال ہے، اور اس کے قوانین و حدود کی پابندی وہ کر ہی نہیں سکتا۔

نفاق کا خطرہ

جو لوگ دعوتِ ایمان کو علانیہ رد کر دیں اُن کا معاملہ تو صاف ہے ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کفر و ایمان کی سرحد اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ وہ دائرۂ اسلامی میں داخل ہو کر کوئی خلل برپا نہیں کر

کر سکتے۔ مگر وہ لوگ جو مومن نہیں، اور ایمان کا اظہار کر کے مسلمانوں کی جماعت میں گھس جاتے ہیں، اور وہ جن کے دلوں میں شک کی بیماری ہے، اور وہ جو ضعیف الایمان ہیں، ان کا وجود نظام اسلامی کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ کیونکہ وہ اسلام کے دائرے میں تو داخل ہو جاتے ہیں، مگر اسلامی اخلاق اور اسلامی سیرت اختیار نہیں کرتے، اسلامی قوانین کا اتباع اور حدودِ الہی کی پابندی نہیں کرتے، اپنے خراب اخلاق و اعمال سے مسلمانوں کے تمدن و تہذیب کو خراب کر دیتے ہیں، اپنے دلوں کے کھوٹ سے مسلمانوں کی قومیت اور سیاسی حرمت کی جڑیں کھوکھلی کر دیتے ہیں، اور ہر اس فتنے کے اٹھانے اور بھڑکانے میں حصہ لیتے ہیں جو اسلام کے خلاف اندر یا باہر سے برپا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو منافق کہا گیا ہے، اور وہ تمام خطرات ایک ایک کر کے بیان کیئے گئے ہیں جو اسلامی جماعت میں ان کے داخل ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان کی صفت یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر حقیقت میں مومن نہیں ہوتے۔

مَنْ يَقُولُ ۱ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا

هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ (البقرہ-۲)

”جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لائے، حالانکہ

وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔“

وہ مسلمانوں سے مسلمانوں کی سی باتیں کرتے ہیں اور کافروں

سے کفار کی سی۔

وَإِذْ يَقُولُ الَّذِينَ ۱ اٰمَنُوا قَالُوا ۲ اٰمَنَّا وَإِذَا

خَلُّوا إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ۔

(البقرہ-۲)

”جب وہ ایمان لانے والوں سے ملے تو کہا کہ ہم ایمان

لے آئے، اور جب اپنے شیاطین کے پاس گئے تو بولے

کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔“

وہ آیات الہی کا مذاق اڑاتے اور ان میں شکوک کا اظہار کرتے ہیں۔

إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ يَكْفُرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ

بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ۔ (النساء-۲۰)

”جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جاتا ہے اور ان

کا مذاق اڑایا جاتا ہے تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو۔“

وہ مذہبی فرائض سے جی پڑاتے ہیں، اور اگر ادا کرتے بھی

ہیں تو مجبوراً محض مسلمانوں کو دکھانے کے لیے، ورنہ حقیقتاً ان

کے دل احکام الہی کی اطاعت سے منحرف ہوتے ہیں۔

وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ

يُرَآؤُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا

مُذَبِّذِينَ بَيْنَ ذَلِكَ لَا إِلَىٰ هَؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ

هَؤُلَاءِ۔ (النساء-۲۱)

”اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو بادل

نخواستہ کھڑے ہوتے ہیں۔ محض لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ خدا

کو یاد نہیں کرتے، اور اگر کرتے بھی ہیں تو کم۔ وہ بیچ میں

مذہذب ہیں، نہ پورے ادھر ہیں نہ پورے ادھر۔“

وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَىٰ وَلَا

يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ۔ (التوبہ - ۷)

”وہ نماز کے لئے نہیں آتے مگر بادلِ نخواستہ اور راہِ خدا

میں خرچ نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ۔“

وَمِنَ الْأَعْدَابِ مَنْ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا۔

(التوبہ - ۱۲)

”اور بدوؤں میں سے بعض ایسے ہیں جو کچھ راہِ خدا میں

خرچ کرتے ہیں اس کو زبردستی کا جرمانہ سمجھتے ہیں۔“

وہ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اسلامی قوانین کا اتباع نہیں

کرتے بلکہ اپنے معاملات میں کفار کے قوانین کی پیروی کرتے ہیں۔

الْمُتَرَالِي الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا

أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ

أَنْ يَتَّخِذُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ

يَكْفُرُوا بِمَا هُمْ فِيهِ شَاكِرُونَ۔ (النساء - ۹)

”کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ

وہ ایمان لائے اس کتاب پر جو تیرے اوپر اتاری گئی ہے اور ان

پر جو تجھ سے پہلے اتاری گئی تھیں مگر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات

شیطانی حاکم کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا جا چکا ہے

کہ اس کا حکم نہ مانیں۔“

ان کے اعمال خود خراب ہوتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے

عقائد اور اعمال بھی خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

يَا مُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَزَيِّنُوا عَنْ الْمَعْرُوفِ

وَيَقْبِضُونَ أَيْدِيَهُمْ نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ۔ (التوبہ - ۹)

”وہ بُرائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ نیک کاموں سے کھینچے رہتے ہیں۔ وہ خدا کو بھول گئے اس لئے خدا نے بھی ان کو بھلا دیا۔“

وَذُوَا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ
سَوَاءً۔ (النساء-۱۲)

”وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی کفر کرو جیسا انہوں نے کفر کیا تاکہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔“

وہ مسلمانوں کے ساتھ اسی وقت تک ہیں جب تک انکا فائدہ ہے۔ جہاں فائدہ کم ہوا اور انہوں نے قوم کا ساتھ چھوڑا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَلْزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ
أَعْطُوا مِنْهَا رَاضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطُوا مِنْهَا إِذَا
هُمْ يَسْخَطُونَ۔ (التوبہ-۷)

”ان میں سے بعض صدقات کی تقسیم میں ہتھ پر طعنہ زنی کرتے ہیں۔ اگر ان کو صدقات میں سے دیا گیا تو خوش ہو گئے اور نہ دیا گیا تو بگڑ گئے۔“

جب اسلام اور مسلمانوں پر مصیبت کا وقت آتا ہے۔ تو وہ جنگ سے انکار کر دیتے ہیں، کیونکہ حقیقت میں نہ تو ان کو اسلام سے محبت ہوتی ہے کہ اس کے لئے کوئی قربانی کریں، نہ وہ اس قربانی پر کسی اجر کے قائل ہوتے ہیں، نہ ان کو اسلام کی حقانیت کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی تائید میں جانیں لڑانے پر آمادہ ہوں۔ وہ طرح طرح سے اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر جنگ میں شریک بھی ہوتے ہیں تو بادلِ سخاوت، بلکہ ان کی شرکت مسلمانوں کے لئے قوت کے بجائے ضعف کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی

اس کیفیت کو سورہ آل عمران (رکوع ۱۲-۱۷) سورہ نساء (رکوع ۱۰-۱۱)۔
 ۱۲-۲۰) سورہ توبہ (رکوع ۷-۱۱-۱۲) اور سورہ احزاب (رکوع ۲) میں
 تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

ان کے سب سے زیادہ خطرناک صفت یہ ہے کہ جب
 مسلمانوں پر مصیبت آتی ہے تو کفار سے مل جاتے ہیں۔ ان کو خبریں
 پہنچاتے ہیں، اُن سے ہمدردی کرتے ہیں، مسلمانوں کی مصیبت پر
 خوش ہوتے ہیں، اپنی قوم سے غداری کر کے کفار سے اعزاز و مناصب
 حاصل کرتے ہیں، ہر فتنہ جو اسلام کے خلاف اٹھتا ہے اس میں
 سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور مسلمانوں کی جماعت میں
 تفرقہ ڈالنے کے لئے سازشیں کرتے رہتے ہیں ان صفات کو بھی
 آل عمران، نساء، توبہ، احزاب، اور منافقون میں مفصلاً بیان کیا گیا
 ہے۔

اس سے اچھی طرح اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نظام اسلامی کے
 قیام و بقا و استحکام کے لئے صحیح اور خالص ایمان ناگزیر ہے ایمان
 کی کمزوری اس نظام کو جڑ سے لے کر آخری شاخ تک کھوکھلا کر دیتی
 ہے اور اس کے خطرناک اثرات سے اخلاق، معاشرت، تمدن،
 تہذیب، سیاست کوئی چیز نہیں بچ سکتی۔

زندگی بعد موت

موت کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے یا نہیں؟ اور ہے تو کیسی ہے؟ یہ سوال حقیقت میں ہمارے علم کی رسائی سے دور ہے کہ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں، جن سے ہم موت کی سرحد کے اُس پار جھانک کر دیکھ سکیں، کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں، جن سے ہم ادھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے، جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ ادھر کچھ ہے یا کچھ نہیں ہے۔ لہذا جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اس کے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے وہ بالکل ایک غیر سائنٹیفک بات کہتا ہے۔ سائنس کی رُو سے نہ تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی زندگی ہے اور نہ یہ کہ کوئی زندگی نہیں ہے۔ جب تک ہم کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں پاتے، کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹیفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی کے بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹیفک رویے کو نباہ سکتے ہیں؟ شاید نہیں، بلکہ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں، تو اُس کے متعلق ہم نفی، اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں، لیکن جب اُسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو، تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ

نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرزِ عمل قائم کریں، یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص سے جس سے آپ واقف نہیں ہیں، اگر اس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو، تو آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ اسکے ایماندار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں، لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو، تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اُسے ایماندار سمجھ کر معاملہ کریں، یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایماندار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے، اُس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے، مگر اس کی ایمانداری کو مشکوک سمجھتے ہوئے، جو معاملہ آپ کریں گے، عملاً اس کی صورت وہی تو ہوگی جو اس کی ایمانداری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی روئے کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے تو اقرار یا انکار بہر حال ناگزیر ہے۔

یہ بات تھوڑے ہی غور و فکر سے آپ کی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک فلسفیانہ سوال نہیں ہے، بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے۔ دراصل ہمارے اخلاقی رویے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دُنیوی زندگی ہے، اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا۔ اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی موجودہ زندگی کا حساب دینا ہوگا، اور وہاں میرا اچھا یا بُرا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا، تو یقیناً میرا

اخلاقی طرزِ عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے، جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اُسے بس یہاں سے کراچی تک جانا ہے، اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت اور ہر اُس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا، جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہو۔ برعکس اس کے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہاں سے کراچی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک ہی منزل ہے۔ اس کے بعد اُسے سمندر پار ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا، جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو پاکستان کا بادشاہ ہے، اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اس پورے کارنامے کا خفیہ ریکارڈ موجود ہے جو میں نے پاکستان میں انجام دیا ہے، اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس درجے کا مستحق ہوں۔ آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرزِ عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص یہاں سے کراچی تک کے سفر کی تیاری کرے گا، اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لئے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے کراچی پہنچنے تک ہے، آگے کچھ نہیں، اور دوسرا یہ خیال کرے گا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلے میں نہیں ہے، بلکہ آخری مرحلے میں ہے۔ پہلا شخص اپنے افعال کے صرف انہی نتائج پر نظر رکھے گا جو کراچی تک کے سفر میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کی نگاہ ان نتائج پر ہوگی، جو سمندر پار دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرزِ عمل کا یہ فرق براہِ راست نتیجہ ہے ان کی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے

متعلق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں سے بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی بعد موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائیں گے، اسکی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اسی زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں، یا کسی بعد کی زندگی اور اسکے نتائج کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت اٹھے گا اور دوسری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے، بلکہ عملی زندگی کا سوال ہے، اور جب بات یہ ہے تو ہمارے لئے اس معاملے میں شک اور تردد کے مقام پر ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں۔ شک کے ساتھ جو رویہ ہم زندگی میں اختیار کریں گے، وہ بھی لامحالہ انکار ہی کے رویے جیسا ہوگا۔ لہذا بہر حال ہم اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں، اگر سائنس اس کے تعین میں سے ہماری مدد نہیں کرتا، تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینا چاہیئے۔

اچھا عقلی استدلال کے لئے ہمارے پاس کیا مواد ہے؟

ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے، اور دوسرے یہ نظام کائنات ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے، آیا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں، یا کوئی چیز بچی رہ جاتی ہے، جس کے لئے کسی دوسری نوعیت کے نظام کی ضرورت ہو۔

دیکھئے، انسان ایک تو جسم رکھتا ہے، جو بہت سے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے جواب کائنات کے

اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیسیں، دریا اور اسی کی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لئے قوانین کی ضرورت ہے، وہ سب کائنات کے اندر کار فرما ہیں، اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں اور ہواؤں کو اپنے حصے کا کام پورا کرنے کا موقع دے رہے ہیں، اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے، جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذائے کر بڑھتا اور نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے، اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں، اور وہ قوانین بھی یہاں پائے جاتے ہیں، جو نشوونما پانے والے اجسام کے لئے درکار ہیں۔

پھر انسان ایک زندہ وجود ہے، جو اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے، اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں۔ خشکی، تری اور ہوا میں بے شمار حیوانات پائے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی تمام و کمال یہاں کار فرما ہیں، جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرہ عمل پر حاوی ہونے کے لئے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے، جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں، اس کے اندر نیکی اور بدی کرنے کا شعور ہے، نیکی اور بدی کی تمیز ہے، نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے، اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بُرا نتیجہ ظاہر ہو اور وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حقیقت اور ناحق،

رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرقے کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں، اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مرتب ہوتے ہیں۔ لہذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے، اسکا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبعی نتائج رونما ہوتے ہیں، اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھئے، کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں کم از کم ہمارے علم کی حد تک کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اخلاقی قوانین کسی طرف کارفرما نظر نہیں آتے، یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت۔ یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے، اور کبھی بلکہ اکثر جوتیوں کی۔ یہاں مادی عناصر کے لئے مقرر قوانین ہیں جن کے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں۔ مگر اخلاقی عناصر کے لئے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے۔ طبعی قوانین کی فرماں روائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبعی قوانین دے دیں، اور بار بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضا کرتا ہے، مگر طبعی قوانین کی

مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ انسان نے خود اپنے تمدنی و سیاسی نظام کے ذریعے سے تھوڑی سی کوشش اس امر کی ہے کہ انسانی اعمال کے اخلاقی نتائج ایک مقرر ضابطے کے مطابق برآمد ہو سکیں۔ مگر یہ کوشش بہت ہی محدود پیمانے پر ہے اور بحد ناقص ہے۔ ایک طرف طبعی قوانین اس کو محدود اور ناقص بناتے ہیں، اور دوسری طرف انسان کی اپنی بہت سی کمزوریاں اس نظام کے نقائص میں اور زیادہ اضافہ کرتی ہیں۔

میں اپنے مدعا کی توضیح چند مثالوں سے کروں گا۔ دیکھئے، ایک شخص اگر کسی دوسرے شخص کا دشمن ہو، اور اس کے گھر میں آگ لگا دے تو اس کا گھر جل جائے گا۔ یہ اس کے افعال کا طبعی نتیجہ ہے، اس کا اخلاقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس شخص کو اتنی ہی سزا ملے جتنا اُس نے ایک خاندان کو نقصان پہنچایا ہے، مگر اس نتیجے کا ظاہر ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ آگ لگانے والے کا سراغ ملے، وہ پولیس کے ہاتھ آسکے، اس پر مجرم ثابت ہو، عدالت پوری طرح اندازہ کر سکے کہ آگ لگنے سے اس خاندان کو اور اُسکی آئندہ نسلوں کو کتنا ٹھیک کتنا نقصان پہنچا ہے، اور پھر انصاف کے ساتھ اس مجرم کو اتنی ہی سزا دے۔ اگر ان شرطوں میں سے کوئی شرط بھی پوری نہ ہو، تو اخلاقی نتیجہ یا تو بالکل ہی ظاہر نہ ہوگا یا اس کا صرف ایک تھوڑا سا حصہ ظاہر ہو کر رہ جائے گا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے حریف کو برباد کر کے وہ شخص دنیا میں مزے سے پھولتا پھلتا رہے۔

اس سے بڑے پیمانے پر ایک اور مثال لیجئے۔ چند اشخاص اپنی قوم میں اثر پیدا کر لیتے ہیں، اور ساری قوم ان کے کہے پر چلنے

لگتی ہے۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں میں قوم پرستی کا اشتعال اور ملک گیری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، گرد و پیش کی قوموں سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں، کھوکھا آدمیوں کو ہلاک کرتے ہیں، ملک کے ملک تباہ کر ڈالتے ہیں، کروڑوں انسانوں کو ذلیل اور پست زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اور انسانی تاریخ پر اُلٹے کسے کاروائیوں کا ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جس کا سلسلہ آئندہ سینکڑوں برس تک پشت در پشت اور نسل در نسل پھیلتا جائے گا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ چند اشخاص، جس جرمِ عظیم کے مرتکب ہوئے ہیں، اس کی مناسب اور منصفانہ سزا ان کو کبھی اس دُنیوی زندگی میں مل سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اگر ان کی بوٹیاں بھی نوچ ڈالی جائیں، اگر انکو زندہ جلا ڈالا جائے یا کوئی اور ایسی سزا دی جائے جو انسان کے بس میں ہے، تب بھی کسی طرح وہ اس نقصان کے برابر سزا نہیں پاسکتے جو انہوں نے کروڑہا انسانوں کو اور ان کی آئندہ بے شمار نسلوں کو پہنچایا ہے۔ موجودہ نظامِ کائنات جن طبعی قوانین پر چل رہا ہے، ان کے تحت کسی طرح یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے جرم کے برابر سزا پاسکیں۔

اسی طرح ان نیک انسانوں کو ایسے جہنوں نے نوعِ انسانی کو حق اور راستی کی تعلیم دی، اور ہدایت کی روشنی دکھائی، جن کے فیض سے بے شمار انسانی نسلیں صدیوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، اور نہ معلوم آئندہ کتنی صدیوں تک اٹھاتی چلی جائیں گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے لوگوں کی خدمات کا پورا صلہ ان کو اس دُنیا میں مل سکے؟ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ موجودہ طبعی قوانین کی حدود کے اندر ایک شخص اپنے اس کام کا پورا صلہ حاصل کر سکتا ہے، جس کا ردِ عمل اس کے

مرنے کے بعد ہزاروں برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیل گیا ہو؟

جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں، اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں، دوسری یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے، اسکے رد عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے، اور اتنی مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسی کے پورے نتائج وصول کرنے کے لئے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے، اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانی، مستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لئے تو موجودہ طبعی دنیا (Physical World) اور اس کے طبعی قوانین کافی ہیں، مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لئے یہ دنیا باکسل ناکافی ہے۔ اس کے لئے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس میں حکمراں قانون (Governing Law) اخلاق کا قانون ہو، اور طبعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں، جسمیں زندگی محدود نہ ہو، بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مرتب ہونے سے رہ گئے ہیں، یا اُسے مرتب ہوئے ہیں، اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مرتب ہو سکیں، جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو۔ جہاں آگ صرف اُس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو، اور مصیبت اس کے حصے میں آئے ہو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا نظام عالم ضرور

ہونا چاہیئے۔

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف ”ہونا چاہیئے“ کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا سوال یہ کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی، تو ہماری عقل اور ہمارا علم، دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے، موجودہ نظام عالم جو طبعی قوانین پر بنا ہے، ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا، اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا، جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی، پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کر دے گا، اور ایک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کر دے گا، وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ، ہر غلطی اور ہر فروگزاشت کے بغیر محفوظ ہوگا۔ ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردِ عمل دُنیا میں ہوا ہے، اس کی پوری روداد موجود ہوگی۔ وہ تمام نسلیں گواہوں کے کھڑے میں حاضر ہوں گی جو اس ردِ عمل سے متاثر ہوئیں۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال و افعال کے نقوش ثبت ہوئے اپنی داستان سنائے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا، پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے، اور کون کتنی سزا کا۔ یہ انعام اور یہ سزا دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم

کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے۔ وہاں کی مقداریں کچھ اور ہوں گی۔ وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے۔ انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں، وہاں وہ اُنصے کا بھرپور صلہ وصول کر سکے گا، بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں، اور اسی انسان کی جن برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزار ہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں، وہ ان کی پوری سزا بٹھگتے گا، بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں مجھے ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے، اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ناممکن ہے، تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہوگا البتہ یہ بات کہ واقع میں ایسا ضرور ہوگا تو اس کا تعین نہ دلیل سے ہو سکتا ہے اور نہ علمی ثبوت سے، اس کے لئے ایمان بالغیب کی ضرورت ہے۔